وجاہت علی سندیلوی

وجاہت علی سندیلوی

قیمت

مجلد تین روپیہ

ناشر

نسیم بکڈپو ، لاٹوش روڈ ، لکھنؤ

ٹیلیفون —— ۲۴۵۵۹

ناشر:۔ عزیز الرحمٰن (بار اول جنوری سنہ ۱۹۷۰ء پرنٹر:۔ سمنا پرنٹنگ پریس لکھنؤ

انتساب

بادلِ ناخواستہ اس وکیل کے نام
جس نے
ایک سندیلوی ادیب کی گردن دبوچ رکھی ہے

نصرتِ منزل — وجاہت علی سندیلوی
سندیلہ — ۳۰ر جنوری سنہ ۱۹۶۹ء

ترتیب

چوہے اور ہم

کسی بھوکے سے ایک شخص نے پوچھا "ایک اور ایک کتنے ؟" بھوکے نے فوراً بلا تامل جواب دیا "دو روٹیاں اور وہ بھی خوب موٹی، اچھی سنکی اور کافی گھی چپڑی ہوئی"۔ ہمارے خیال میں بھوکے کا جواب بالکل درست تھا کیونکہ بھوکا انسان اپنے دماغ سے نہیں بلکہ معدے سے سوچتا ہے۔ اسی طرح جب ہم نے اپنے ایک وزیر با تدبیر کی تقریر جو انھوں نے چوہے کھانے کے فائدوں پر اسمبلی میں کی تھی سنی، تو اس کے خوش ذائقہ امکانات سے ہمارے منہ میں پانی بھر آیا اور پیٹ میں بے اختیار چوہے کودنے لگے چنانچہ دماغ کو معزول کر کے معدے نے فوراً اعلان کر دیا کہ وہ چوہے کھائے گا اور ضرور کھائے گا۔ ہم نے اپنے آپ کو اپنے عزت مآب وزیر سے اس مسئلے پر بالکل متفق پایا اور ہم بیساختہ چیخ اٹھے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

واقعی ہمارے وزیر صاحب کتنی دور کی کوڑی لائے تھے بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے پہاڑ کھود کر چوہا برآمد کر لیا تھا۔ ان کی دریافت تھی کہ چوہے میں دودھ انڈے، مچھلی اور تیتر بٹیر وغیرہ سے بھی زیادہ پروٹین اور دیگر حیاتین پائے جاتے ہیں اور اس کو بطور خوراک استعمال کرنے سے انسانی صحت کو نقصان پہنچنا تو بہت دور رہا سراسر فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ مطلب صاف تھا کہ چوہے کھاؤ اور بہت دن

کیونکہ غالباً وہ دن دور نہیں جب ہر سرکاری دفتر اور ریلوے اسٹیشن پر عوام کی عاقبت سدھارنے کی خاطر اس قسم کے اشتہار چپکے ہوئے نظر آئیں گے، اور کسی ضرورت سے زیادہ تندرست بیتا کی تصویر اور نیچے یہ الفاظ "یہ اور ان کے بچے ہمیشہ کھاتے ہیں چوہے!"

چوہے کھانے کے چٹکلے سے ہمارے وزیر صاحب نے ہم کو نہ صرف ایک بہت لذیذ، صحت بخش اور بہت افراط سے مل جانے والی غذا سے متعارف کر دیا بلکہ چٹکی بجاتے ملک میں غلہ کی کمی کی لعنت کو ایک چھو منتر سے ہمیشہ کے لئے ملک بدر کر دیا۔ آپ چوہے کھائیں گے اور ان کو لذیذ، صحت بخش اور پھر بالکل مفت پا کر زیادہ کھائیں گے تو ظاہر ہے کہ پھر غلہ کم کھائیں گے۔ ایک بچت تو یہ ہوئی اور دوسری یہ کہ جو چوہے آپ کے منہ کا نوالہ بن جائیں گے وہ جو غلہ زہر مار کر جاتے وہ خود بخود بچ جائے گا۔ اسی کو شاید ہم خرما و ہم ثواب کہتے ہیں البتہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر ہندوستان کی وہ آبادی جو اب تک پروٹین، حیاتین اور اسی قسم کی دوسری عیاشیوں سے محروم تھی اگر چوہوں کی بدولت ان کا استعمال کرنے لگی تو اس کی عمر میں بہت بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ اور یقیناً اس کی شرح پیدائش میں بھی۔ اور پھر جب بڈھوں اور بڑھیوں کی زیادہ تعداد گودیں بچے لئے نظر آنے لگے گی تو کھائے ہوئے چوہے کے خمیازے کی صورت میں غلہ کی مانگ بھی بڑھ جائے گی لیکن یہ اندیشہ آجکل کا نہیں بلکہ مستقبل بعید کا ہے اور اس وقت نہ ہم آپ ہوں گے اور نہ ہمارے وزیر، چوہے نوش بہادر۔ چوہے ہوں تو ہوا کریں ہوں گے نہیں تو کھائے کیسے جائیں گے؟۔

زیادہ دن نہیں گزرے جب محکمہ زراعت کے ایک اونچے صوبائی افسر نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ چوہے ہمارے اناج کا نہ صرف کھیتوں، کھلیانوں، اور گوداموں میں بلکہ خود ہماری ناک کے نیچے ہمارے گھروں میں بڑا ستیاناس کر دیتے ہیں لہذا

ہمیں فوراً سے پیشتر ان کا قلع قمع کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد ہمارے ضلع کے ایک افسر نے چوہا مار ہفتہ منانے کے سلسلہ میں ایک باقاعدہ مقابلے کا اشتہار چھپوا کر جس میں چوہے کے ساتھ ایک ایسے وزیر صاحب کی کہ جن کی مونچھیں چوہے کی مونچھوں سے بس کچھ ہی انیس بیس تھیں تصویر بھی تھی، ہر گلی کوچے میں چپکوا دیا تھا۔ ایک وفادار شہری کی حیثیت سے کمر ہمت کس کر ہم نے اس ہفتے کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ چوہے دان ناکارہ ثابت ہوئے تھے لہٰذا مجبوراً لاٹھی اٹھا کر ہم تن تنہا اپنے سارے گھر میں چوہوں کی تلاش اور ان کا ناش کرنے کی غرض سے لٹھ بازی کرتے رہے تھے۔ اس مہم میں ہم نے ایک الماری کا شیشہ، دو چینی کی طشتریاں اور ایک پانی کا مٹکا توڑ ڈالا تھا لیکن ہماری بدقسمتی سے ہم سے کوئی لیڈر قسم کا چوہا تو کیا ایک سوکھی چوہیا تک اپنے کیفر کردار کو نہیں پہونچ سکی تھی۔ پتا یہ چلا کہ ان کی پوری قوم انتہائی چالاک اور پینترے باز واقع ہوئی ہے۔ ہر طرف سے محصور ہو جانے کے بعد بھی وہ ہماری لاٹھی کا وار اس صفائی سے بچا لے جاتے، جیسے پلیٹ فارم پر پھینکے ہوئے گندے انڈوں اور جوتوں کو، کوئی بہت تجربے کار الکشن باز نیتا۔

عاجز آ کر مجبوراً ہم نے ایک مری ہوئی چھپکلی کی دم کاٹ کر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا اور لفافے میں بند کر کے اپنے ضلع کے محکمۂ زراعت کے افسر اعلیٰ کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا۔ اس کارگزاری پر ہم کو پہلا انعام ملا۔ اور جب ایک وزیر صاحب بھرے جلسے میں پر تکلف دعوت کے بعد اور پر جوش تالیوں کے درمیان ہم کو انعام دے چکے تو انھوں نے چلتے چلاتے ہمارے کان میں یہ بھی پھونک دیا کہ آئندہ چناؤ کے موقع پر ہمیں پارٹی ٹکٹ دیئے جانے کی وہ بھرپور سفارش کریں گے۔

کوشش کے بعد ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس چوہے مار ہفتے کا کیا نتیجہ نکلا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے چوہے مار ڈالے گئے ہوں کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے ہوں اور اتنی

بہت سی غذا کو ضائع ہوتے دیکھ کر ہمارے وزیر صاحب کو اس کے پروٹین اور دیگر حیاتین اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے بچے کے پیٹ یاد آگئے ہوں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہے جس طرح ہم، فرسٹ پرائز ونر، کو جل دے گئے تھے دوسروں کو بھی دے گئے ہوں اور ہاتھ نہ لگے ہوں، اور ہمارے وزیر صاحب کو مجبوراً یہ سوچنا پڑا ہو کہ ان کو پکڑنے اور مارنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان کو کھا لیا جائے۔ اس سے پیشتر بھی ایک لال بجھکڑ نے ایک اناڑی کو اسی قسم کا مشورہ کوئی چڑیا پکڑنے کے سلسلے میں دیا تھا: "چڑیا کے سر پر سویرے سویرے تھوڑا سا موم رکھ دو۔ جب سورج نکلے گا تو یہ موم پگھل کر چڑیا کی آنکھوں میں چلا جائے گا اور اسے کچھ سوجھائی نہ دے گا۔ اس وقت چپکے سے جا کر اسے پکڑ لو۔" چوہے پکڑ کر تو مارے نہیں جا سکے اب انھیں کھا لیجیے گا تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائیگا۔

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ محض چند الفاظ سے ایک جادو کی چھڑی بنا کر ہمارے وزیر صاحب نے ہمارے نیم فاقہ کش ملک کو نمبر ایک قسم کی غذا سے بھرپور دیش بنا دیا اور ہم پلک جھپکاتے غذا کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہو گئے بلکہ اس قابل بن گئے کہ اب بہت جلد امریکہ اور روس جیسے خوشحال ملک ہم سے ہماری فاضل غذا مانگنے آئیں گے اور ہم طرح طرح کے نخرے دکھا کر ان کو اس بات پر مجبور کر سکیں گے کہ وہ پہلے اپنے سکے کی قیمت گھٹائیں اور پھر ہم سے کچھ چوہوں کی دُمیں لے جائیں۔ اس کے علاوہ چوہوں کی یہ فراوانی اور بڑھتی ہوئی آبادی دیکھ کر خود ملک کے اندر اب کس کے منہ میں دانت ہیں جو یہ آواز تک اٹھا سکے کہ حکومت غذا کی فراہمی کا انتظام نہیں کر پاتی۔ غذا آپ کے گھر میں موجود ہے اب اگر آپ اسے خود نہ کھائیے تو اس میں بیچاری حکومت کا کیا قصور؟

کوئی فریادی اگر آ کر گڑگڑائے گا "حضور گھر میں کھانے کو ایک دانہ بھی

نہیں۔ چوہے ڈنڑ پیل رہے ہیں" تو ہمارے وزیر صاحب فوراً جواب دیں گے" اجی ان کسرتی چوہوں کو کیوں نہیں کھاتے؟ آپ کی غذا خود آپ کے گھر میں پھدک رہی ہے اور آپ میرا وقت خراب کر رہے ہیں۔ جائیے جائیے مجھے فلاں ناری نکیتن کا ادگھاٹن کرنے کے لئے ابھی جانا ہے وہاں چوہوں کی ایک نئی قسم کی پھلوری پکائے جانے کا بھی تجربہ کیا جائے گا۔"

پلنگ پر لیٹے لیٹے ہم نے دو چوہوں کو اپنے سامنے الماری پر دوڑتے دیکھا۔ ایک چوہیا طاق پر رکھے ہوئے ڈبے پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک قوی ہیکل چوہا ہمارے کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کوٹ کی جیب سے نکل کر ایک ہی جست میں نعمت خانے کی چھت پر پھاند گیا لیکن چوہوں کی ان خر مستیوں پر روز کی طرح ہمیں کسی تشویش کا احساس نہیں ہوا بلکہ یہ سوچ کر ایک قسم کی خوشی ہوئی کہ ہمارے گھر میں غذا کی کوئی کمی نہیں ہے اور اب محلے والوں سے بوقت ضرورت سیر بھر آٹا یا پاؤ بھر دال ادھار مانگنے کے بجائے ہم خود دوسرے ضرورت مندوں کو جن کے گھروں میں چوہے نہ ہوں گے، کبھی کبھار ایک آدھ چوہا اپنی سیر چشمی سے دے دیا کریں گے۔

گھر کی غذائی صورت حال سے، جو ہمیشہ اپنے ملک کی غذائی صورت حال کی طرح تشویشناک رہتی، کچھ اطمینان ہوا تو ہماری ذرا آنکھ لگ گئی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نیل بیکہ چوہا ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھا بڑے غصے سے چچیا رہا ہے " تم انسانوں کی پوری قوم انتہائی چالاک اور مکار ہے۔ پہلے ہم چوہے جس گھر میں بھی پہونچ جاتے نہ صرف طرح طرح کے اناجوں اور کھانے کی چیزوں کی بلکہ گھی دودھ اور بالائی کی ریل پیل دکھائی پڑتی۔ تم نے نہیں معلوم اب یہ ساری چیزیں کہاں سمیٹ کر رکھ دی ہیں۔ ہر گھر میں تعاڑ دکھری دکھائی دیتی ہے۔ بڑے سے بڑے گھر میں غلہ بڑی بڑی مٹکوروں کے بجائے چھوٹے چھوٹے ٹین کے ڈبوں میں رکھا جاتا ہے۔ گھی

دودھ اور بالائی کا کہیں پتا اور نشان بھی نہیں ملتا۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ تم کمبختوں نے ہر چیز میں ملاوٹ کر رکھی ہے۔ تمہارے دیئے ہوئے زہر کو ہم کھا لیتے ہیں تو ہمارا کچھ بھی نہیں بگڑتا لیکن جب تمہاری غذا کھاتے ہیں جس میں اینٹ، پتھر، چونا، برادہ، گھاس، مٹی اور کیٹلے کا تیل اور موبل آئل وغیرہ کا میل خود غذا سے کہیں زیادہ بڑھ لیا ہے، تو ہماری صحت پر بہت خراب اثر پڑتا ہے اور ہم بے موت مرنے لگتے ہیں۔"

چونکہ اس ناشدنی نے ہماری پوری نسل انسانی کو بدنام کیا تھا لہٰذا ہمیں صبر کا یارا نہیں رہا اور ہم برس ہی تو پڑے اُس پر "بس! بس! چوہے کے بچے اپنا منہ بند کر ناشکری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ صدیوں سے تیری نسل ہم انسانوں کی پیدا کی ہوئی غذا پر حرامخوری سے پل رہی ہے اور آج تو آیا ہے ہم کو نام دھرنے؟ ہمارے محکمۂ اعداد و شمار نے باقاعدہ چوہے شماری کے بعد بتایا ہے کہ ہمارے ملک میں انسانوں سے آٹھ گنا زائد چوہے بستے ہیں اور آٹھ چوہے ایک انسان کے برابر غذا کھا جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری نسل اسی قدر غلہ کھا جاتی ہے جس قدر کہ ہم انسان کھاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں غلہ کا جو کال پڑا ہے اس کا اصل سبب ہمارے غذائی وزیروں کی نا اہلیت نہیں بلکہ تم چوہے ہو۔ لیکن خیر اب وقت آ گیا ہے کہ تمہاری نسل ہماری نسل کا قرضہ اصل مع سود چکا دے۔ تم ہماری غذا کھاتے ہو ہم خود تمہیں کھائیں گے ....."

ہمارے سر کے قریب ایک زور کا جھٹکا ہوا اور ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تو دیکھا کہ سرہانے کی الماری پر سے چائے کا ڈبہ زمین پر گر پڑا ہے اور گرانے والا ایک مسٹنڈا اور مچھندر چوہا وہیں بیٹھا ہم سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا تھا۔ "کہو بے کیسی رہی؟" ہم قاضی نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے گھر

کے چوہے بڑے سیانے ہیں۔ وہ نقصان کر کے الٹا ہمیں کو آنکھیں دکھاتے ہیں اور اس وقت تک ہماری موجودگی کو خاطر میں نہیں لاتے جب تک ان کو بھگانے کی کوئی خاص کوشش نہ کی جائے۔ لیکن اس وقت جب کہ ہم نے اس چوہے کو نفرت اور غصے سے نہیں بلکہ اس پر اشتہا انداز سے دیکھا کہ اس کی سری اور پائے اور کلیجی اور گردے کیسے ہوں گے اور اس میں کتنا گوشت نکلے گا تو وہ ہم سے نظریں ملاتے ہی ایسا بھاگا جیسے کسی آوارہ نظرباز سے کوئی پاکباز حسینہ۔ ایک نعرۂ مستانہ لگا کر ہم اس کی طرف جھپٹے اور اگر اس وقت وہ ہمارے ہاتھ آجاتا تو ہم اپنے چوہے کھانے کی مہم کا افتتاح شاید اسی کو کچا چبا کر کر دیتے۔ الماری سے لڑ جانے کے باعث ہم اپنی ناک سہلاتے ہوئے بیٹھ گئے اور ہمارا شکار الماری کے کسی سوراخ سے نکل کر اللہ کا پیارا نہیں بلکہ نو دو گیارہ ہو گیا۔

ہم نے خود تو پکا ارادہ کر لیا تھا کہ چوہوں کو کھائیں گے لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہمارا یہ ارادہ ہماری نصف بہتر کے تعاون کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتا تھا۔ ہماری بیگم دنیا میں صرف دو چیزوں سے ڈرتیں۔ ایک تو چوہے اور دوسرے اپنے چچا سے۔ چچا کے متعلق تو ابھی تک کوئی سرکاری احکام جاری نہیں ہوئے تھے کیونکہ چھپکلی، چچھوندر سے لے کر ہاتھی تک ابھی بہت سے جانور وقت ضرورت کے لئے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ لہٰذا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، البتہ چوہے کھانے کے متعلق انھیں اپنا ہم خیال بنانا بلی کی گردن میں گھنٹی باندھنے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا۔

ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ہماری بیگم نے آکر ایک شانِ دلربائی سے کہا "آج ٹھیلے والا ترکاری نہیں لایا۔ منڈی سے جا کر کوئی ترکاری لے آئیے۔ شام کو پکانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"بہت کھا چکے ترکاری درکاری ہم۔ اب ہرگز نہیں کھائیں گے" ہم ٹھنک کر بولے۔

"تو کیا صرف دال کھائیے گا اس وقت؟"

"دال کھائیں ہمارے دشمن! ہم تو کھائیں گے انڈے، مچھلی، تیتر اور بٹیر کا مرکب"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ چوہے! یہ جو مفت کا منوں گوشت ہمارے چاروں طرف پھدک رہا ہے اس کے ہوتے ہوئے ہم پاگل ہیں جو اس گرمی اور دھوپ میں منڈی جا کر دھکے الگ کھائیں اور اپنی گاڑھی کمائی کے پیسے الگ خرچ کریں؟"

"کیا ہو گیا ہے تم کو؟ کدھر پھدک رہا ہے یہ منوں گوشت؟"

"تمہیں نہیں دکھائی پڑتے یہ چوہے؟ وہ دیکھو ایک تو سامنے ہی بیٹھا تمہیں اپنی دم سے سلام کر رہا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" بیگم کی مارے خوف کے گھگھی سی بندھنے لگی۔

"مطلب یہ کہ آؤ ہم تم مل کر گھر کے یہ سارے چوہے ہڑپ کر جائیں" ہم نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ ایک چوہیا ہمارے بستر کی تکیہ کے نیچے سے نکل کر بھاگی اور ایک چیخ کے ساتھ بیگم سامنے رکھی ہوئی کرسی پر گریں اور کچھ بے سدھ سی ہو گئیں۔ اسی وقت دخل درمعقولات کرتے ہوئے ایک موٹا سا چوہا نعمت خانے پر سے "لانگ جمپ" کر کے پھاندا۔ ہم بے تحاشہ اس کے پیچھے دوڑے اور ایک دوسری چیخ کے ساتھ ہوش میں آتے ہوئے بیگم دوڑ کر چپل پہنے ہمارے بستر پہ کھڑی ہو گئیں سامنے دیوار سے ٹکرانے کے بعد ہم خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ چوہا جست لگانے کے ساتھ ہی ساتھ تیز دوڑنے میں بھی بڑا "فرسٹ" تھا۔

بیگم قریب قریب روتے ہوئے بولیں "ایسی گھناؤنی باتیں کر کے مجھے پریشان کرنے سے فائدہ ؟"

ہم نے بڑے لیڈرانہ انداز میں انھیں سمجھانا شروع کیا کہ چوہے کھانے سے کیا روحانی۔ مادی۔ اقتصادی اور سیاسی فائدے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ غلے اور پیسے وقت اور زحمت کی بچت کے علاوہ ایک بہت بڑی بچت گھی، تیل، نمک، شکر صابن، اناج اور کپڑے وغیرہ کے بجٹ میں بھی اس موذی جانور سے چھٹکارا پاکر ہو جائے گی۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کیسے کیسے لذیذ اور چٹپٹے کھانے اور پکوان، زبان کی رونق اور معدے کی زینت بنیں گے اور پھر اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو ہم دوسرے غیر ضروری جانوروں پر اس سے بھی زیادہ دلچسپ تجربے کر سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہماری اس بے ربط مگر مدلل تقریر کے دوران بیگم منہ ڈھانپے برابر سسکیاں لے رہی تھیں۔ ٹیپ کے بند پر جب ہم نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ چوہوں کو کھا جانے کی تلقین کی تو انھیں ایک بڑے زور کی اُبکائی آئی اور وہ بھاگیں غسلخانے میں، کچھ دیر بعد ہم اپنے کمرے سے اس بات کا جائزہ لینے کے لئے کہ گھر میں کتنے چوہوں یعنی ہمارے غذائی سرمائے کی موجودگی کا امکان ہے، باہر نکلے تو نوکرانی سے معلوم ہوا کہ بیگم رکشا بلوا کر اپنے میکے جا چکی ہیں۔

دو چوہے مخالف سمتوں سے ہمارے سامنے بھاگے اور ہم ان کو پکڑنے کچھ اس انداز سے دو طرف دوڑے کہ چوہے تو ملے نہیں البتہ ایک چیخ مار کر اور نہیں معلوم کیا بڑبڑاتی ہوئی نوکرانی بھاگی اور نہ صرف گھر سے باہر ہو گئی بلکہ ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئی۔

نوکرانی کم بخت نے باہر نکل کر نہیں معلوم کیا گل کھلایا کہ تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں

اپنے صدر دروازے پر کچھ گڑبڑ اور شور و غل سنائی دیا۔ ہم دروازہ کھول کر باہر آئے تو دیکھا کہ ہمارے گھر کے سامنے ناک پر رومال رکھے ہوئے لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہے۔ ہم کو دیکھتے ہی اس ہجوم میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کسی ناشدنی نے نعرہ بلند کیا "ہمارے محلے میں چوہا خور" اور سارا مجمع ایک زبان ہو کر چیخا "نہیں رہے گا! نہیں رہے گا" ایک اور پاجی نے ہانک لگائی "جو کھائے موس کا ماس" اور غالباً پہلے سے طے شدہ اسکیم کے تحت سارا مجمع بھر گرجا "اس کا کر دیں ستیاناس" اور پھر یہ اور اسی قبیلے کے دوسرے خطرناک نعرے ایسے دھڑا دھڑ دغنے لگے جیسے کسی میدان جنگ میں توپیں۔ مجمع نے ایک دم سے بڑھنا اور پھیلنا شروع کر دیا اور ذرا ہی سی دیر میں نہ صرف سڑک کی ساری ٹریفک بند ہو گئی بلکہ جہاں تک دکھائی پڑتا ناک پر رومال رکھے ہوئے آدمیوں کا دریا موجیں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ ہمارے غریب خانے سے تھوڑے ہی فاصلے پر جو سرکس ہو رہا تھا اس کے سارے تماشائی اس کو چھوڑ کر ہمیں دیکھنے امنڈ آئے تھے۔ ہم نے اپنے گھر میں واپس ہونا چاہا لیکن اب ہمارے اور ہمارے دروازے کے درمیان آدمیوں کی قطاروں کی کئی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں۔

مختلف اقسام کے نعرے برابر لگ رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمیں یہ تعجب خیز احساس ہوا کہ ہم اپنے پیروں پر کھڑے نہیں بلکہ کچھ لوگوں کے کندھوں پر بیٹھے ہیں۔ نعروں کے درمیان اس قسم کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"آپ ہی چوہے کھاتے ہیں؟"

"شکل بھی تو چوہوں جیسی پائی ہے!"

"اس کا منہ کالا کر کے باقاعدہ جلوس نکلنا چاہیئے"

"اسی چوہے خور کی بدولت سارے محلہ میں سڑاند اور بدبو پھیلی رہتی ہے۔

"میں نے اس کے دروازے پر ایک آدھی کھائی ہوئی کتے کی لاش بھی دیکھی تھی۔" وغیرہ وغیرہ۔

ہماری خوش قسمتی سے پولیس کے اڑن دستے نے آنے میں دیر نہیں کی۔ چراغ جلنے سے پیشتر ہم سڑک پر ناجائز مجمع اکٹھا کرنے اور امن عامہ کو خطرے میں ڈالنے کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے اور مجمع کے ہاتھوں تھوڑی سی مار پیٹ کے بعد پر جوش نعروں کے درمیان بڑی دھوم دھام سے پولیس کی لاری میں سنبھال کر حوالات بھیج دیئے گئے۔

حوالات پہنچ کر ہم نے داروغہ صاحب کی خوشامد درآمد کر کے اپنے ہم مشرب منسٹری کو فون کرایا لیکن وہ کسی ناری نکیتن کا اُدگھاٹن کرنے جا چکے تھے رنجی بیگم کے چچا کو فون کرنا چاہا تو پتا چلا کہ ان کے ٹیلیفون کا تار کوئی چوہا پہلے ہی کتر چکا تھا۔

ماہر نفسیات

اسے میرا احساس کمتری سمجھئے یا عقل سلیم کا تقاضہ کہ میں ہر قسم کے ماہر فن یعنی اسپشلسٹ انسان سے خواہ وہ صرف ماہر امراض پوشیدہ ہی کیوں نہ ہو، گھبراتا اور کنائی کاٹتا ہوں، اور اپنے فن کے متعلق اپنے آپ کو حرف آخر کا درجہ دینے والے حضرات کو دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنیرکٹ کا یہ مقولہ یاد آجاتا ہے کہ سب سے گمراہ کن جھوٹ ہمیں سب سے تابناک سچائیوں ہی میں ملتے ہیں۔

ایک روز میں کافی ہاؤس میں اپنے دوست جتن سنگھ کے انتظار میں بیٹھا تھا اور اس میں وقت کی پابندی کے احساس کی کمی پر اپنی جھنجلاہٹ کافی کی پیالیوں اور سگرٹوں پر اتار رہا تھا۔ دفعتہً ایک چھوٹی آنکھوں اور پھولے گالوں والے بھاری بھرکم بزرگ آکر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے جغرافیے میں مجھے سب سے قابل توجہ بات یہ معلوم ہوئی کہ انھوں نے اپنے انڈے کی طرح صفاچٹ سر پر بال نہ ہونے کی تلافی بڑی گھنی مونچھوں اور گنجان داڑھی سے کر رکھی تھی انھوں نے ایک ٹھنڈی بلا شکر کی چائے کا آرڈر دیا تو میں چونک کر انھیں گھورنے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے اپنی کافی کی پیالی میں ایک چمچا شکر ڈالا تو اس بے تکلفی سے گویا میرے برسوں کے شناسا ہوں، مجھ سے مخاطب ہوئے "زیادہ شکر محبت کی تشنگی کی علامت

"جی۔" میرے منہ سے نکلا اور بدحواسی میں شکر کا ایک چمچا اور میری پیالی میں پڑ گیا۔ ایک پرجوش قہقہے کے بعد ہنستے ہوئے فرمانے لگے "محبت کی نہیں، آپ کو مجنوں کی تشنگی ہے اور یہ جو آپ پھونک پھونک کر ابلتی ہوئی کافی پی رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ اپنے ماحول سے غیر مطمئن ہیں اور آپ نے جس انداز سے اپنا ایک ہاتھ کرسی کے ہتھے پر رکھ چھوڑا ہے، وہ غمازی کر رہا ہے کہ ابھی اس شہر میں آئے ہوئے آپ کو زیادہ وقت نہیں گزر رہا ہے اور آپ کی بے چین آنکھیں بتا رہی ہیں کہ آپ شاعر یا رومان پسند قسم کے انسان ہیں۔ اور بہت جلد فکر سخن یا تلاش محبت میں مبتلا ہو جانے والے ہیں۔"

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میں کپڑے اتارے کسی ایکسرے مشین کے سامنے ننگا کھڑا ہوں۔ مجھے چھینک آنے والی تھی لیکن میں نے اس خیال سے روک لیا کہ کہیں وہ بھی میری کسی منحوسیت کی نقیب نہ بن جائے۔ میں نے تلملا کر جواب دیا "اگر آپ کو اس طرح میرا ہاتھ رکھنا ناپسند ہے تو لیجیے میں اس کو اس طرح رکھ لیتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر میں نے اپنا ہاتھ کرسی پر سے اٹھا کر میز پر رکھ لیا۔

فرط مسرت سے اپنا زانو پیٹتے ہوئے بولے۔ "اب آپ کا ہاتھ آپ کی جنسی ناآسودگی کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔"

شرمندگی اور غصے سے میرا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنا چغلخور ہاتھ کاٹ کر پھینک دوں، میں نے اسے جیب میں ڈال لیا اور کچھ بگڑ کر عرض کیا۔ "لیکن آپ کو میری تشنگی، بے اطمینانی اور ناآسودگی سے کیوں ہمدردی پیدا ہو رہی ہے؟ خصوصاً جب کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی تعارف بھی نہیں ہے۔"

بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "ایک ماہر نفسیات اپنے گرد و پیش کے لوگوں کا جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے پر مجبور ہے۔ کیا خود آپ کو نفسیات سے کوئی دلچسپی ہے؟"

"جی ہاں کبھی تھی لیکن اب بالکل نہیں ہے۔" میں نے جل کر کہا۔ بڑی محبت سے پوچھنے "اجی آپ کو نفسیات سے دلچسپی نہیں ہے تو پھر آپ پر شعور، لاشعور، تحت الشعور کے اسرار و رموز کیسے آشکار ہو سکتے ہیں؟"

اب مجھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ "اسپتال، جیل یا پاگل خانے پہونچ کر" یہ کہہ کر میں نے اٹھ کر باہر جانا چاہا، لیکن بارش شروع ہو چکی تھی، کوئی دوسری جگہ خالی نہ تھی اور مجھے بادل ناخواستہ اپنی کرسی پر واپس آنا پڑا۔

میری گستاخی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے "دیکھئے آپ کا کرسی سے اٹھنا راہِ فرار تلاش کرنا تھا۔ آپ اپنی زندگی کے ناخوشگوار واقعات کا مقابلہ کرنے کے بجائے ان سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"ہر سمجھدار انسان یہی کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تو اس طرح آپ اپنی زندگی کی گتھیاں کیسے سلجھا سکتے ہیں؟"

"میں اپنی زندگی کی گتھیاں نہیں سلجھاتا ہوں بلکہ زندگی کی گتھیاں مجھ کو سلجھاتی رہتی ہیں۔"

میرے اس حماقت کے جواب پر خوش ہو کر بولے "دیکھئے نفسیات نہ جانتے ہوئے بھی آپ نے نفسیات کا ایک بہت نازک مسئلہ بیان کر دیا ہے۔ آپ میں ایذا رسانی کے جذبہ کے ساتھ ہی ساتھ ایذا پسندی کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔"

میں خاموش رہا۔

دفعتاً ماہر نفسیات سڑک کے دوسری طرف ایک دکان کے برآمدے کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں ایک پانچ چھ سال کی لڑکی کھڑی ایک بڑا سا بسکٹ کھا رہی تھی اور بار بار اپنے ماتھے پر منتشر بالوں کو جھٹکتی جاتی۔

کہنے لگے "دیکھئے آپ سامنے اس لڑکی کو دیکھ رہے ہیں۔ بتایئے آپ کیا

سمجھے ؟"

"یہی کہ لڑکی بسکٹ کھا رہی ہے۔"

"لیکن وہ اپنے بال کیوں جھٹک رہی ہے؟"

"غالباً مکھیاں ہنکانے کے لئے۔"

"مکھیاں تو وہ اپنے ایک ہاتھ سے بھی ہنکا سکتی ہے۔"

"مگر وہ دوسرے ہاتھ کا بھی صحیح مصرف بسکٹ پکڑنا سمجھتی ہے تاکہ بسکٹ زیادہ مضبوطی سے اس کی گرفت میں رہے۔"

"لیکن آپ کھمبے کی آڑ سے وہ چھوٹا سا ننگ دھڑنگ لڑکا بھی دیکھ رہے ہیں۔"

"جی ہاں اور غالباً اس کی بے چین نگاہوں نے لڑکی کو اپنا بسکٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"بالکل غلط! وہ لڑکی اپنے بال جھٹک کر اس لڑکے کو اپنی جانب مخاطب کر رہی ہے۔"

"لیکن اس وقت جبکہ وہ ایک بسکٹ بلا شرکت غیرے کھا رہی ہے تو اسے اس بدصورت لڑکے کو اپنی جانب مخاطب کرنے کی کیا ضرورت ہے اور پھر لڑکا تو یوں بھی بسکٹ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے لہٰذا اس کو مخاطب کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

معنی خیز تبسم کے ساتھ فرمانے لگے۔ "یہی تو میں عرض کر رہا تھا کہ آپ ان نفسیاتی موشگافیوں کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔" اس کے بعد انھوں نے فی البدیہہ علم نفسیات پر ایک مقالہ پڑھ ڈالا جس کے ماتحت ہر بچہ پیدائشی مجنوں اور فرہاد ہوتا ہے۔

میں کیا بولتا؟ خاموش رہا۔ پانی برابر برستا ہی چلا جاتا تھا۔ بھاگنا ناممکن تھا لہٰذا میں ماہر نفسیات سے اظہار بیزاری کے لئے باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

لڑکی اور لڑکا چلے گئے سامنے برآمدے میں ایک چھوٹا سا ڈنڈا زینے کے سہارے کھڑا تھا۔ ایک کتا آیا۔ اس نے پہلے وہ ڈنڈا سونگھا پھر اس پر پیشاب کیا اور آگے بڑھ گیا۔

ماہر نفسیات اچھل کر بولے "کچھ دیکھا آپ نے؟"

"جی! کتا!" میں ہکلایا۔

بڑی ہمدردی سے بولے "دیکھئے وہ کتا اسی قسم کے ڈنڈے سے کہیں مارا گیا تھا۔ اس نے پہلے سونگھ کر ڈنڈے کے متعلق تصدیق کی پھر اظہار نفرت میں اس پر پیشاب کر گیا۔"

"تو آپ انسانی نفسیات کے ساتھ ہی ساتھ جانوروں کی نفسیات کے بھی ماہر ہیں؟"

خود اعتمادی سے سینہ پھلا کر بولے "جذباتی حیثیت سے انسان اور جانور میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔"

میں نے عرض کیا "آپ نے اس کتے کی حرکت ناشائستہ سے یہ نتیجہ کیوں نہیں نکالا کہ کل شام کو وہ اسی مقام پر اپنے ایک دوست سے ملا تھا اور چونکہ آج پھر ملنا چاہتا تھا لہٰذا یاد دہانی کے لئے وہ اس ڈنڈے پر اپنا وزٹنگ کارڈ ٹانگ گیا ہے۔"

میری یاوہ گوئی کو سنی ان سنی کر کے بولے:۔

"دیکھئے وہ ایک صاحب چھتری لگائے آ رہے ہیں" میں نے جھک کر دیکھا چیتن سنگھ آ رہا تھا۔ بڑے وثوق سے فرمانے لگے "دیکھئے اس شخص کا کردار محض اس کی چال ڈھال سے بتایا جا سکتا ہے۔ اس کی تیز روی بتا رہی ہے کہ اس کے بچپن کی پیچیدگیاں اس پر اب بھی حاوی ہیں۔ یہ چھتری ٹیڑھی کئے ہوئے ہے لہٰذا بے وقوف اور عاقبت نا اندیش ہے۔ یہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلتا ہے۔ اسے تعاقب

کا ڈر ہے ۔ یہ یقیناً چور ہے ۔"

جیتن سنگھ نے کافی ہاؤس کا رخ کیا تو ماہر نفسیات کچھ گھبرائے اور وہ ہال میں داخل ہو کر اپنے ہاتھ بڑھائے میری طرف لپکا تو ماہر نفسیات نے بوکھلا کر کرسی چھوڑ دی اور منہ پھیر کر دوسری طرف چل پڑے ۔ جیتن سنگھ نے دوڑ کر انھیں روکا ۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں چاچا جی ، آئیے آپ کو اپنے ایک بہت عزیز دوست سے ملا دوں ۔"

میرا منہ تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا اور پھر جیتن سنگھ نے ماہر نفسیات کا تعارف مجھ سے یوں کرایا " آپ میرے ہونیوالے خسر ہیں اور میری شادی کے متعلق کچھ تفصیلات طے کرنے آج ہی بنارس سے تشریف لائے ہیں ۔"

ماہر نفسیات غریب پر بجلی سی گر پڑی تھی ۔ وہ بار بار اٹھ کر جانے کی کوشش کر رہے تھے ۔ میں نے اشارہ سے انھیں اطمینان دلایا لیکن ان کی بدحواسی میں کوئی افاقہ نہیں ہوا ۔ جیتن سنگھ ہاتھ دھونے غسل خانے گیا تو ماہر نفسیات نے بڑی لجاجت سے کہا " میری دور کی نگاہ بہت کمزور ہے ۔ میں جیتن کو پہچان نہیں پایا تھا ۔"

میں نے انھیں تسلی دی ۔ " وہ تو ظاہر ہی ہے ! لیکن بہر حال میری زبان بند رہے گی ، آپ بالکل اطمینان رکھیئے ۔"

ماہر نفسیات نے پھر میرے سامنے زبان نہیں کھولی اور میں جیتن سنگھ کی بارات میں بنارس گیا تو بڑی شفقت سے فرمانے لگے " آپ میں ایک ماہر نفسیات بن جانے کی بڑی صلاحیتیں موجود ہیں ۔" اور میں نے انتہائی انکساری سے جواب دیا ـــــ

" معاف کیجئے گا میری دور کی نگاہ بہت کمزور ہے !" اور پھر ہم دونوں نے ہاتھ ملا ملا کر ایک ساتھ اتنے قہقہے لگائے کہ شعور ، لاشعور ، اور تحت الشعور کی حدیں پار کر کے بدشعور تک پہونچ گئے ۔

غالب اور بالغ

میرے بہت عزیز لیکن پریشان کن دوست بھوپو مل بھکڑ کو شہر کے مختلف کونوں گوشوں اور تہہ خانوں سے مشتبہ، حواس باختہ، جھکی، خبطی اور گڑبڑ جھالا قسم کے انسانوں کو ڈھونڈھ بلکہ کھود نکالنے میں خاص ملکہ حاصل تھا اور پھر ان نادرالوجود شخصیتوں کو جان سے ایسے ہی چمٹ جائیں جیسے مقناطیس میں لوہا، اپنے دوستوں سے متعارف کرانے بلکہ ان کے سر منڈھنے میں وہ بڑے فیاض اور عاقبت نا اندیش واقع ہوئے تھے۔ ان کی اس حماقت کی بدولت بغیر معلوم کتنے سادھوؤں پیروں، فقیروں، جادوگروں، نجومیوں، شاعروں اور اسی قسم کے دیگر فنکاروں سے مجھے جبراً شرف نیاز حاصل کرایا جاچکا تھا اور ان میں سے بعض سے بعد میں جان چھڑانے کے لئے مجھے نہ صرف اپنا مکان بلکہ اکثر حلیہ تک تبدیل کرنا پڑا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ میں اپنے برآمدے میں بیٹھا نائی سے بال کٹوا رہا تھا کہ دفعتاً بھکڑ جی ایک موٹے تازے پھندر قسم کے بزرگ کو جن کی کبھی گولہ گنج میں کپڑے سینے کی چھوٹی سی دکان تھی ساتھ لئے کسی بلائے بے درماں کی طرح اچانک نمودار ہوئے اور مجھے دیکھتے ہی چیخے "ریختی کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب! لیجئے حضرت نابالغ اجی توبہ حضرت بالغ کو تو میں لے آیا" گویا حضرت بالغ سے ملنے کے لئے میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ ہی تو رہا تھا اور میں نے ان کو اپنے غریب خانے

پر پکڑ لانے کے لئے بھکڑ جی کی خاص طور سے متعین کیا تھا۔ اور پھر انھوں نے اس زور شور اور طمطراق سے ان کا تعارف کرایا۔ ° آپ جدید ترین شاعری کے تازہ ترین علمبردار ہیں۔ آپ ایک بالکل عجوبہ صنف شاعری کے جنم داتا ہیں آپ نے حضرت غالب کو ایک حیات نو بخشی ہے۔ آپ دنیائے ادب میں آنیوالے انقلاب کے نقیب ہیں۔ آپ شاہ راہ ادب پر روشنی کے ایک نئے مینارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ..... وغیرہ وغیرہ۔

بیچارے حضرت بالغ کو اس مدح سرائی کے دوران " ذرہ نوازی ہے آپ کی،" کہتے ہوئے دو تین مرتبہ کرسی سے اٹھ اٹھ کر سلام کرنا پڑا اور جب میں نے عرض کیا " بڑی عزت افزائی ہوئی آپ سے مل کر " تو خلوص کی بدہضمی سے وہ بھکڑ جی سے بغل گیر ہونے کے بعد مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور میرے کپڑوں پر بالوں کی جو کٹی ہوئی فصل پڑی تھی اس کی وہ بیاختہ بٹائی بھی کرا لے گئے۔

نائی نے میرے جان چھوڑی تو میں غسل کرنے کے لئے تھوڑے دقفے کی مہلت چاہی لیکن بھکڑ جی کب ماننے والے تھے بولے " حضرت بغلول! جی تو بر بالغ صاحب کا کلام سننے کے بعد غسل صحت کرو تو زیادہ مناسب ہوگا اور پھر حضرت بالغ کو اشارہ کیا " جی ہاں بس اب زیادہ نہ ترسایئے اور بقول شخصے شروع ہو جایئے ورنہ کہیں یہ غسل صحت غسل میت نہ ہو جائے "

حضرت بالغ خالی وقت ہیں کھنکار کھنکور کر تیار ہی بیٹھے تھے فوراً چالو ہو گئے " ذرہ نوازی ہے آپ کی " ایک نظم پیش کرتا ہوں ..... " بھکڑ جی نے لقمہ دیا " پہلے نظم کا عنوان تو بتایئے۔ میں تو آپ کی نظموں سے زیادہ ان کے عنوانوں پر مرتا ہوں۔" حضرت بالغ نے حلق صاف کی " نظم کا عنوان کچھ طویل ہے لیکن عرض کئے دیتا ہوں۔ فرمائش عاشق کی معشوق سے بابت اٹھا دے بجائے رقیب

کے بزم ناز سے اور تقاضا کرنا عاشق کا معشوق سے وصل کا بزعم اس کے کہ وہ اب نوکر ہے ساتھ ایک دھمکی کے اور جواب ناشائستہ معہ کلمات تلخ و ترش معشوق کا عاشق کو اس کی فرمائش، تقاضا اور دھمکی کے باب میں۔"

بھکڑ جی پھڑک اٹھے" واللہ یہ نظم کا عنوان ہے یا کسی دل پھینک۔ امیدوار کا الیکشن مینی فسٹو" غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھ پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو چکا تھا۔

"ذرہ نوازی ہے آپ کی!" فرما کر حضرت بالغ یوں رواں ہوئے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے۔
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی۔
غیر کو مجھ سے محبت ہی سہی۔
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں۔
لیتا نہیں مرے دل آوارہ کی خبر؟
یہ جانتا تو لٹاتا نہ گھر کو میں۔
آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے۔
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن
نہ کیجیو طعن سے پھر تم، ہم ستمگر ہیں

بھکڑ جی واہ واہ کرتے ہوئے چیخے "باغل صاحب اجی تو یہ بالغ صاحب ایسی ایسی نظمیں باندھی ہیں آپ نے اور اس قیامت کا گریز فرمایا ہے کہ دن کو تارے نظر آنے لگے ہیں افسوس تو بس صرف اس قدر ہے کہ آج چچا غالب بقید حیات

نہیں ورنہ...... میں عرض کر رہا تھا.... جی ہاں ورنہ آپ خود قید حیات سے آزاد ہو چکے ہوتے۔"

حضرت بالغ "ذرہ نوازی ہے آپ کی" دہرا کر پھر گویا ہوئے "اب ذرا معشوق کا جواب ملاحظہ ہو:۔

ہنس کے بولے تیرے سر کی قسم ہے ہم کو
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
بس چپ رہو! ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے
ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟
شرم تم کو مگر نہیں آتی
اب کسی بات پر نہیں آتی؟

پھکڑ جی "بہت خوب! بہت خوب! یہ آپ ہی کا حصہ ہے ابلغ صاحب اجی توبہ بالغ صاحب" میری طرف مخاطب ہو کر "حضرت! اس کو کہتے ہیں عالم آرائی!"

میں نے فریاد کی "مجھے اس کلام کی شانِ نزول تو سمجھائیے۔ معاف کیجئے گا مجھے تو وحشت ہو رہی ہے اسے سن سن کر"

پھکڑ جی نے میری بدمذاقی پر منہ بنایا۔ حضرت بالغ نے کہا۔" ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ میں آج کل دنیائے شاعری پر پلاسٹک سرجری قسم کا ایک بالکل انوکھا تجربہ

یعنی قدیم شعراء کو جدید بنا رہا ہوں اور اس کے لیے میں نے سب سے پہلے حضرت غالب کو منتخب کیا ہے۔"

بھکڑ جی: "گویا تختۂ مشق بنایا ہے آپ نے سب سے پہلے ان کو۔ جس طرح آپ پہلے کبھی نابالغ تھے اور اب ماشاءاللہ بالغ ہو چکے ہیں۔ اسی طرح آپ ان شعراء کو جو پرانے ہو چکے تھے اپٹوڈیٹ بنا رہے ہیں۔ ہاہاہا۔ اس قسم کی اکھاڑ پچھاڑ سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے نئے قلم، دوات اور کاغذ کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ زیادہ تر کام صرف قینچی ہی سے نکل جاتا ہے۔"

حضرت بالغ: "ذرہ نوازی ہے آپ کی! جی ہاں میں عرض کر رہا تھا کہ میں حضرت غالب کے کلام کی پرانی شراب کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق نئی بوتلوں میں بند کر کے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری شاعرانہ حمیت اور غیرت کو گوارا نہ ہوا کہ حضرت غالب جیسا مجرب اور مستند شاعر محض ایک قدیم شاعر کہلائے چنانچہ میں نے اس کے ہی مصرعوں کو نیکران سے آج کل کے نئے موضوعات کی ایک دوسری دنیا آباد کر دی ہے اور اس طرح اسے جدید ترین شعراء کی صف اول میں کھڑا کر دیا ہے۔ آپ سنیں گے تو سر دھنیں گے کہ واقعی حضرت غالب میں ایک جدید ترین شاعر بننے کی کیسی کیسی صلاحیتیں موجود تھیں البتہ وقت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ خود فرمایا ہے:

ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بھکڑ جی: "غالب صاحب اجی توبہ بالغ صاحب آپ بالغ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ غالباً غافل بھی ہیں لہٰذا آپ اس قسم کی تمہیدوں پر اپنا وقت مت ضائع کیجیئے (میری طرف اشارہ کر کے)" اس قسم کے حضرات نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات۔ آپ اب کوئی دوسری نظم سنائیے لیکن جی ہاں مع چٹنی کے میرا مطلب ساتھ

عنوان کے"۔

حضرت بالغ "ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ دوسری نظم حاضر ہے۔ عنوان ہے اس کا دکھنا پاؤں معشوق کے بسبب دوڑ دھوپ غیر مناسب۔ فرمائش کرنا اس کا عاشق سے پاتبر داب دینے ان کے۔ غلط سمجھنا عاشق کا بوجہ ثقل سماعت فرمائش معشوق کی اور داب نے لگنا پیر پاسبان کے اور بدظن ہو جانا معشوق کا عاشق اور پاسبان دونوں سے"۔

بھکڑ جی "شکر ہے اغلب صاحب اجی توبہ بالغ صاحب کہ وہ آپ سے بدظن نہیں ہوا"۔

حضرت بالغ "ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ نظم ملاحظہ ہو:۔

مر جاؤں کیوں نہ رشک سے جب وہ تن نازک
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

بھکڑ جی۔ "غالباً شاعر کو یہ رشک ہو رہا ہو گا کہ معشوق نے یہ کلیلیں اس کے ٹوٹے ہوئے مزار پہ کیوں نہ بھریں۔ واللہ کیا لاحول میرا مطلب ماحول پیدا کیا ہے آپ نے"۔

حضرت بالغ "ذرہ نوازی ہے آپ کی"۔ (اور پھر پہلے کے دونوں مصرعے دہراکر)

دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں
ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے
کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجئے
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بھکڑ جی " غبلو صاحب اجی توبہ بالغ صاحب کمال کر دیا آپ نے اور آخری مصرع کی اشاعت پر سر پھوڑ لینے کا جی چاہتا ہے۔ اِس بان کے پیر دب رہے ہوں گے تو معشوق پر کیا بیتی ؟ آخر یہ منظر دیکھ کر اس نے اپنی چوڑیاں کیسے پھوڑیں" ؟

حضرت بالغ " ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ آخری ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

تعجب سے وہ بولا، یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو ؟
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے !

بھکڑ جی " الغل صاحب اجی توبہ بالغ صاحب آپ نے تو واقعی قلم توڑ دیا بلکہ قینچی کند کر ڈالی بلکہ سچ پوچھئے تو دیوان غالب چاک کر ڈالا ع دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے۔ لیکن ابھی پیاس بجھی نہیں بلکہ اور بڑھتی ہی جا رہی ہے"۔

حضرت بالغ " ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ ایک دوسری نظم ملاحظہ ہو:۔

عنوان ہے پینا شراب قرض شاعر کا، بنا کر بھیس فقیروں کا، ساتھ اس امید کے کہ نہ دینا پڑیں دام اس کے بوجہ اٹھ جانے رحم ساقی کو اور برتاؤ سخت ساقی کا اور مارا جانا شاعر کا مع اقبال جرم اس کے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

حضرت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ آجائے رحم

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

جو تم سے شہر میں دو چار ہوں تو کیوں کر ہو

عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

ہوس کو پاس ناموس وفا کیا ؟

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے

ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا ؟ کہیئے ؟

بھکڑ جی " مجھ سے قسم لے لیجئے کہ ہاتھ میں جوتا ہی ہو گا۔ لیکن پھر آخر ہوا کیا ؟
حضرت بالغ " ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ آخری ٹکڑے کو حسن سماعت بخشئے
شاعر عرض کرتا ہے۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

نہ بھاگا جائے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیئے

اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور ہے

پھکڑ جی (جھوم کر) " یہ شاعری نہیں الہام ہے الہام جو بلبلو صاحب اجی توبہ بالغ صاحب آپ پر معلم الملکوت براہ راست نازل کر رہا ہے۔"

حضرت بالغ " ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ ایک نظم آپ کے مذاق کی ہے ذرا توجہ سے ملاحظہ فرمایئے گا۔ عنوان ہے جانا معشوق کا عاشق کے گھر غالباً بہ نیت سرقہ دھونا پیر عاشق کا معشوق کے ساتھ کھینچ تان نامناسب اور زخمی ہو جانا پیر معشوق کے اور فرمائش بے ہودہ معشوق کی عاشق سے اور سراسیمگی عاشق کی معشوق کی نیت میں فتور دیکھ کر۔"

اب بالغ صاحب اٹومیٹک ہو چکے تھے یعنی خود چالو ہو کر کسی مزید تحریک کے بغیر اپنی نظم اگلنے لگے تھے۔

پھکڑ جی: بھئی اس نظم میں تو بارہ مسالوں کا لطف آ جائے گا۔"

حضرت بالغ " ذرہ نوازی ہے آپ کی۔

وہ آئیں گھر ہمارے خدا کی قدرت ہے
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہے
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے ؟
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں

بات کا تبنگڑ

روز پیتا نہیں، پی لیتا ہوں گاہے گاہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

مستِ کب بندِ قبا باندھتے ہیں
اس تکلف سے کہ جیسے بت کدے کا در کھلا

کہتے ہیں ہم تجھ کو منھ دکھلائیں کیا
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

اے شوق یاں اجازت تسلیم ہوش ہے
شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیئے
کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
ننگ پیری کا ہے جوانی میری
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

وہ نوے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

بھکرہ جی" (سر پیٹتے ہوئے) غبلو صاحب اجی توبہ بالغ صاحب آپ نے تو
بغلولیت میرا مطلب بلوغیت کے تمام ہی مدارج طے کر ڈالے ہیں اپنی اس کھچڑی
میں۔ بس اب ایک آخری باونڈری اور ہو جائے ع

سر جائے یا رہے پر نہ رہیں کہے بغیر میری جانب اشارہ کر کے" گھور رہی
ہیں جلاد کی طرح یہ! آج تک یہ صرف صاحب سیف اور صاحب قلم کے قائل
تھے لیکن اب ان جیسے درپے اعتراض کو بھی آپ جیسے صاحب سقراطن کا لوہا
ماننا پڑے گا"

میں" تو کیا حضرت بالغ کا پورا دیوان آج ہی سُن ڈالنے کا ارادہ ہے؟"

بھکرہ جی " بو غلے صاحب اجی توبہ بالغ صاحب آج کا کام کل پر ٹالنے کے
قائل نہیں یہ چلے تو بس چلتے ہی چلے جاتے ہیں۔

ع بھان سے وہ غیرت صرصر کھلا
کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا

حضرت بالغ، ذرہ نوازی ہے آپ کی۔

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے
شب کو ان کے جی میں کیا آیا کہ عریاں ہو گئیں
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

واں اس کو ہولِ دل ہے یاں میں ہوں شرمسار
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا!

بھکڑ جی دہاڑ کر حضرت بالغ سے بیساختہ بغل گیر ہو جاتے ہیں "سبحان اللہ سبحان اللہ، واقعی یہ شاعری نہیں یہ فن عالی نشان ہے۔ آسمان سے براہ راست تارے توڑ لائے ہیں آپ! اس کو سن کر بس کچھ اس قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ ع اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں! لیکن ابنل اجی تو یہ بالغ صاحب اس نظم کا عنوان تو بتایا ہی نہیں آپ نے گویا بغیر دولھا کے شادی رچا دی۔"

حضرت بالغ "ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ اس نظم کا عنوان ہے ۔۔۔۔"
میں کرسی چھوڑ کر بھاگ نکلا اور بھکڑ جی اور حضرت بالغ بڑے ٹھٹ تک میرے پیچھے چیختے ہوئے دوڑے۔ "اجی اس نظم کا عنوان تو فردوس گوش کرتے جایئے۔"

میرے میدان چھوڑ بھاگنے کے بعد بھکڑ جی حضرت بالغ کو اپنے ساتھ کچھ اس انداز سے لے کر چلے جیسے کوئی مداری اپنے کسی ہونہار جانور کو ڈگڈگی بجاتا ہوا لئے چلتا ہے۔ اس اعصاب جھنجھوڑ تجربے کے بعد مجھے اپنی عافیت صرف اسی میں نظر آئی کہ دوڑ کر اپنے غسل خانے میں پناہ گزیں ہو جاؤں۔

مرزا نخچیر

مرزا بڑی بدحواسی سے گھر میں گھسے تو کواڑوں کو اس زور و شور سے بند کیا کہ صرف ان کی چولیں کیا مکان کی بنیادیں بھی ہل گئیں۔ کنڈی بند کر کے اندر پہونچے تو ترکاری کے جھولے کو تخت پر ٹپکا اور شیروانی اتارنے سے زیادہ نوچ کر الگنی کی طرف ایسی تاک کر پھینکی وہ الگنی کو پھاند کر کھڑونچی سے جا لپٹی۔ اس کے بعد اظہار وحشت کے لئے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنی ٹوپی اتار کر بیوی کے پاندان پر دے ماری اور اپنی داڑھی کھجلاتے ہوئے صحنچی میں ٹہلنے لگے۔

اس ساری کارروائی کا خاموش تماشائی صرف گھر کا کتا شیرا تھا جو پلنگ کے نیچے اطمینان سے لیٹا ہوا ایک آنکھ بند کئے ایک کھولے، مرزا کی حرکات بڑے غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ مرزا کی نظریں اس پر پڑیں تو انھیں اس کے اس طرح دیکھنے میں ایک ایک کھلا ہوا انداز تمسخر نظر آیا۔ وہ جھنجلا کر اس کی طرف بڑھے اور اس کے قریب پیر پٹخ کر "چل بے یہاں سے ناشدنی!" کہا تو وہ بڑی شان استغنا سے مسکراتا، دم ہلاتا، باورچی خانے کی طرف چل پڑا۔ مرزا کو اس کی یہ ادا پھوٹی آنکھ نہ بھائی بلکہ اس خیال سے دل پر چوٹ سی لگی کہ دیکھو یہ ٹکے کا جانور بھی مجھے مسخرا سمجھ کر منہ چڑاتا ہے۔ انھیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ شیرا دم نہیں ہلا رہا ہے بلکہ دراصل اپنی دم سے انھیں چونچ دکھلا رہا ہے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پیر کا جوتا اتار کر اس سے زیادہ اس کی دم کو تاک کر مارا۔ جوتا کئی سو میل کی رفتار

سے پرواز کرتا ہوا کتے کی دم سے کئی گز فاصلے پر پانی سے بھرے ہوئے تسلے میں غڑاپ سے جا ڈوبا اور اس آواز سے اوپر چھتری پر بیٹھے ہوئے کبوتر پھڑ پھڑا کر اڑ پڑے۔

ایک جوتے کی مفارقت نے مرزا کو دوسرا جوتا بھی اتار کر پلنگ پر بیٹھ جانے کے لئے مجبور کر دیا۔ اب انھوں نے ہانک لگائی ۔" ارے کہاں ہو ممّن کی ماں ؟" جواب نہیں ملا تو پھر چیخے ۔" سانپ سونگھ گیا ہے سب کو اس گھر میں!" اور پھر مقابلتاً کچھ دھیمے لہجے میں بڑبڑائے "کیا سب اللہ کے پیارے ہو گئے اس قبرستان میں ؟ ۔"

"کیوں کیا ہوا ؟ آج ترکاری لینے گئے تو بس بازار ہی کے ہو گئے۔ لڑکے باسی دال کھا کر اسکول سدھارے ہیں۔ آپ کو کیا ؟"

"لڑکے اسکول سدھارے ہیں اور میں جیل خانے سدھار رہا ہوں۔ اب تو بر آئی آپ کی منہ مانگی مراد ؟"

"کیا ہزیان بک رہے ہیں آپ ؟ جیل جانے کے لئے بڑا دل گردہ چاہیئے۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم بغیر دل گردے کے زندہ ہیں اب تک ! چہ خوش! اور ابھی جو تھانے کے سپاہی آئیں گے ہم کو پکڑنے تو بس آپ کی اس صفائی پر کہ ہمارے دل گردہ نہیں ہے، وہ ہمیں چھوڑ کر منہ پیٹتے واپس چلے جائیں گے۔"

"کیسا تھانہ اور کیسے سپاہی ؟ کیا اس موئے بانگڑو داس کے یہاں شطرنج کھیلتے ہوئے دھر لئے گئے ؟ یہی کہتی تھی ......"

"بس بس خدا کے غضب سے ڈریئے۔ میرا ہر دوست آپ کو لچا اور شہدا ہی نظر آتا ہے۔ خبردار جو ہم نے کسی کی شان میں کوئی ناشائستہ الفاظ سُنے۔"

"خود ہی پولیس اور تھانے کا نعرہ لے بیٹھے ہیں آپ ؟ پولیس لچوں اور شہدوں

کے پیچھے نہیں گھومتی ہے تو اور کس کے ؟"

"اب یہاں آکر پوری بات سنئے گا یا وہیں سے حلق میں لاؤڈ اسپیکر لگائے سارے محلہ میں میری بداعمالیاں اور بدقماشیاں نشر کرتی رہیئے گا ۔"

"اور ہانڈی کو جلنے کے لئے چھوڑ دوں ؟"

"چولھے میں گئی ہانڈی، ہمیں نہ ہوں گے تو ہانڈی کیا آپ کا سگا شیرا کھائیگا؟"

"اے نوج ! شیرا میرا سگا کیوں ہونے لگا ۔ سگا ہوگا تمہارا جو ایسے خبیث کُتے پر جان چھڑکتے ہو ۔"

"ہم جان چھڑکتے ہیں شیرا پر ؟ اجی حد کر دی جھوٹ کی تم نے بھی ۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ کتنا مبارک دن ہوگا وہ، جب اس نجاست کے پوٹ سے ہمارا گھر پاک ہو جائے گا ۔ ہم تو دعا مانگتے ہیں کہ وہ کم بخت کل کو مرتا ہو تو آج ہی مر جائے ۔"

"کیوں کسی بے زبان کا صبر سمیٹتے ہیں آپ ؟"

"اجی وہ بے زبان ہے اور ہم زبان دراز ! ڈیڑھ ہاتھ کی تو دُم ہے اُس سالے کی ۔"

"ہزار بار منع کر دیا کہ اس قسم کے واہی تباہی رشتے مت جوڑا کیجئے !"

"تو کٹوا کیوں نہیں دیتیں دم اس کی ؟"

"اس کی دُم آپ کو کیا کھلتی ہے ؟"

"یہ بھی ایک ہی رہی گویا کہ ہمیں اس کی دُم سے کوئی مطلب ہی نہیں ۔ ہم اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی بھٹیار خانے میں رہتے ہیں !"

"توبہ توبہ ! ناک میں دم کر دیتے ہیں آپ ! اپنی اوٹ پٹانگ بجا اس سے !"

"سرکاری سپاہی ہمارا وارنٹ گرفتاری لئے محلے میں گھوم رہے ہیں ۔ اور یہ عورت کتے کی دم کاٹنے لئے ہماری جان کو رو رہی ہے ۔"

"دم کا قصہ میں نے شروع کیا تھا؟"

"اور کیا ہم نے جس کا ایک پہر حوالات کے اندر ہے؟"

بیگم باورچی خانے سے باہر نکل آتی ہیں۔ "دشمنوں کے کان بہرے یہ حوالات کون جا رہا ہے اور کیوں؟"

"دشمنوں کے کان بہرے بھی ہوں گے تو بھی آپ کی چیخ پکار سے سُن لیں گے کہ یہ ناچیز بندہ، حقیر، دلگیر، المتخلص بہ نخچیر جیل جا رہا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟ جیل میں بھی کوئی مشاعرہ ہو رہا ہے۔"

"جیل میں مشاعرے کی بھی ایک ہی کہی۔ اجی بیگم صاحبہ جیل میں غزلیں نہیں پڑھی جاتیں بلکہ چکیاں پیسی جاتی ہیں۔"

بیگم مرزا کے پاس ہی پلنگ پہ آ کر بیٹھ جاتی ہیں اور پان دان کھول کر پان بنانے لگتی ہیں" اب خدا کے لئے بتا بھی چکئے کہ کیا بات ہے۔ جب بھی گھر میں قدم رکھتے ہیں آپ مجھے دہلانے کے لئے کوئی نیا شگوفہ چھوڑ دیتے ہیں۔"

"گویا کہ ہم اپنی خوشی سے تفریحاً محض تبدیلِ آب و ہوا کے لئے جیل جا رہے ہیں اور وہاں کسی مشاعرے میں غزل پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"للہ، اب رحم کیجئے اور بتا بھی ڈالئے کہ خدانخواستہ جیل جانے کی کیا بات ہے۔"

"جان بوجھ کر انجان بنتی ہیں آپ! اجی وہی انیم کا معاملہ پھر میرے کسی دشمن نے کھڑا کر دیا ہے!"

"بیس سال ہو چکے ہیں اس موئے معاملے کو اور ابھی تک وہ کسی بھوت کی طرح آپ کے سر پہ سوار ہے۔"

"اجی میں نے بھی تو وہ تھپڑ دیا تھا اس انیمچی کے منہ پہ کہ چھٹی کا دودھ یاد

آگیا ہوگا اس کے باپ کو۔"

"لیکن گھر آکر ہلدی اور چونا تو آپ ہی کے تھوپا گیا تھا۔"

"اجی وہ تو میں تھپڑ مارنے کی جھونک میں ہی خود گر گیا تھا نالی میں۔"

"اچھا تو یوں ہی سہی کہ آپ نے کسی انیچی کے تھپڑ مار دیا تھا تو اب بیس سال کے بعد وہ معاملہ پھر کیسے کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"تھپڑ مارتے وقت میں نے اسے اپنا نام اور پتہ کیب بتا دیا تھا۔ وہ کم بخت انیچی اتنا زبردست تھپڑ کھانے کے بعد بچلا کب بیٹھا ہوگا۔ میرا نام اور پتہ دریافت کرتا پھرا ہوگا اور اب جب میرے کسی دشمن نے اسے بتا دیا ہوگا تو اس نے میرے نام کا وارنٹ کٹا دیا ہے۔"

"لیکن یہ واقعہ تو مراد آباد کا تھا اور اب آپ بیس سال سے لکھنؤ میں ہیں اور آپ نے اپنا تخلص بھی دلگیر بدل کر تنجیر رکھ لیا ہے۔"

"اجی ایک ہی سلطنت کا معاملہ ہے اور پھر چار گھنٹوں میں مراد آباد سے لکھنؤ میل گاڑی آتی ہے۔"

"ہر دوسرے تیسرے مہینے جب کسی کانسٹبل کو دیکھ لیتے ہیں آپ فوراً اس جھاڑ دیہرے انیچی کا قصہ یاد کر کے ہولنے لگتے ہیں۔"

"قسم ہے آپ کے سر کی ابھی جب میں بازار سے واپس آرہا تھا تو بانگڑ والی کے چبوترے پر خفیہ پولیس کے کچھ لوگ میرا اور میرے والد بزرگوار مرحوم کا نام لے لیکر ملکہ ایک سرکاری کاغذ سے پڑھ پڑھ کر میرے گھر کا پتہ پوچھ رہے تھے۔"

کوئی باہری دروازے کی کنڈی کھڑکھڑاتا ہے۔ بیگم دروازے کے پاس چلی جاتی ہیں اور مرزا ہڑبڑا کر پلنگ کے نیچے گھس جاتے ہیں۔

"کیا مرزا تنجیر ولد مرزا دلاور جنگ تشریف رکھتے ہیں؟"

بیگم : کون صاحب ہیں ؟

"کیا مرزا صاحب باہر تشریف لاسکتے ہیں ؟"

"کیا کام ہے ؟"

بانگڑو داس " بھابھی تسلیم! میں ہوں بانگڑو داس! میرے ساتھ بھکڑی مل نبتن خاں اور کچھ لوگ گھامڑ پرشاد کے لئے بھائی صاحب اور آپ کا ووٹ مانگنے آئے ہیں"

"تو اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ جدھر آپ اُدھر ہم"

کئی آوازیں "شکریہ! بہت بہت شکریہ! بھولیے گا نہیں گھامڑ داس کا انتخابی نشان گدھا ہے"

بیگم مسکراتی ہوئی کھڑکی سے واپس چلی آتی ہیں۔ مرزا صاحب کپڑے جھاڑتے ہوئے پلنگ کے نیچے سے برآمد ہوتے ہیں۔

بیگم نے مسکرا کر پوچھا

"یہ کیا؟ یاد شت!"

مرزا نے غصے کا منہ بناتے ہوئے جواب دیا

"اجی وہ شیرا کا بچہ میرا ایک جوتا کہیں اٹھالے گیا ہے اسی کو پلنگ کے نیچے ڈھونڈھ رہا تھا"

بھتیجے کے نام

پیارے بھتیجے۔ جیتے رہو۔

تم نے اپنے چار افسانے بھیج کر مجھ سے ان پر اصلاح کرنے کی درخواست پیش کی ہے۔ مجھے خیال گذرتا ہے کہ میں ان افسانوں کے یا ان سے ملتے جلتے واقعات اور کردار کہیں دیکھ چکا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ خواب میں۔ کیونکہ اس طرف میں کافی دنوں تک بدخوابی کا مریض رہ چکا ہوں۔ بہرکیف ان افسانوں کو پڑھ کر جو بدمزگی پیدا ہوگئی تھی اس کی تلافی تمہاری اس سعادت مندی سے ہوگئی کہ تم نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں افسانہ نگاروں میں سے صرف اپنے چچا کو اپنے افسانوں پر اصلاح کرنے کے قابل سمجھا۔ میں ان افسانوں پر اصلاح تو خیر کیا البتہ اس سلسلے میں اپنے چند تجربات سے تم کو ضرور مستفید کرنا چاہتا ہوں۔

سنو بھتیجے! افسانوں پر اصلاح کی نہیں جاتی بلکہ خود بخود ہو جایا کرتی ہے جب کوئی اچھا افسانہ منظر عام پر آتا ہے تو بہو کے افسانہ نگار اس کو ایک رسیلی بڑی سمجھ کر اس پر دوڑ پڑتے ہیں اور اس کو اس طرح سے چبا کر اور جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں کہ اس کے ابتدائی خدوخال کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایک افسانے کے سیکڑوں چربے اتار کر رکھ دیئے جاتے ہیں اور اس کوشش میں اتفاقاً کوئی نیا افسانہ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی پرانے افسانے میں اصلاح بھی ہو جایا کرتی ہے یعنی وہ پہلے سے بہتر ہو جایا کرتا ہے۔ ہمارا ادب روسی۔ فرانسیسی اور خصوصاً انگریزی افسانوں کے بگڑے ہوئے چربوں سے بھرا پڑا ہے لیکن کہیں کہیں ہاں کوئی

ایسا جرثومہ بھی نظر آجاتا ہے جو اپنے اصل سے بڑھ چڑھ گیا ہے۔ لہٰذا میرا بزرگانہ مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے افسانوں پر اصلاح لینے کے بجائے دوسروں کے افسانوں پر اصلاح دینا شروع کردو۔ اور اس طرح اگر تمہارا شوق افسانہ نگاری باقی رہا! تو انشاء اللہ بہت جلد تمہارے قلم سے ایسے افسانے نکلنے لگیں گے کہ جنھیں دوسرے افسانہ نگار قابلِ اصلاح سمجھنے لگیں گے۔ افسانہ نگاری کی معراج یہی ہے۔

تم نے اپنے چار افسانے چار دنوں میں لکھے ہیں۔ یہ رفتار کم ہے۔ افسانے دماغ سے نہیں بلکہ نوکِ قلم سے لکھے جاتے ہیں۔ تم اپنی رفتار فوراً بڑھاؤ ورنہ تم افسانہ نگاروں کی ہوائی جہاز والی برادری میں محض ایک بیل گاڑی سمجھے جاؤ گے کرشن کمار ـــ زبیدہ اکرم۔ شوق جہازی ـــ دہشت بھارتی وغیرہ کی زریں مثالیں تمہارے سامنے ہیں۔ ادب اگر ضبطِ تولید کا قائل ہو جائے تو بہت سے پنساریوں کی دوکانیں بند ہو جائیں گی اور ملک کی تجارت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔ تمہیں ایک دن میں کم سے کم ایک درجن افسانے لکھنے چاہئیں تاکہ ہر ماہ ہندوستان بھر کے ہر رسالے میں تمہارا کم سے کم ایک افسانہ تو ضرور شائع ہو جایا کرے اور ناظرین تمہارے افسانے پڑھتے پڑھتے اس قدر بے خود ہو جائیں کہ ان کے پاس تمہیں ایک سحر طراز افسانہ نگار تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی راہِ فرار باقی نہ رہے۔

تم نے اپنے افسانوں کے نام سچی محبت۔ ماں کی وصیت۔ بھوکا بھکاری اور چالاک جادوگر رکھے ہیں۔ اس قسم کے نام اب بہت پرانے ہو چکے ہیں۔ آج کل کچھ اس قسم کے ناموں کا چلن ہے۔ "جب پتھر چیخے" "اور آسمان روتا رہا"۔ "گھونگھٹ میں کالی ہنسی"۔ "کتا بھونکے گا" وغیرہ وغیرہ۔ ان نئے ناموں سے ایڈیٹر صاحبان بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں اور جب تک وہ کسی نئے اور

مجوبہ نام کا افسانہ شائع نہیں کرلیتے انھیں اپنی نالائقی کا احساس بری طرح ستاتا رہتا ہے۔

افسانے کی جدید ترین ٹکنیک کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ افسانے کو ایک تسلسل میں ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کے پڑھتے پڑھتے اکثر پڑھنے والا سوجایا کرتا ہے۔ پڑھنے والے کو بقید ہوش و حواس رکھنے کا سب سے مجرب نسخہ یہ ہے کہ افسانے میں جو بات سب سے آخر میں کہنا چاہیئے اسے سب سے پہلے کہو ۔ آخری بات درمیان میں، اور درمیانی بات کو بالکل آخر میں کہو مثلاً اگر تمہیں یہ کہنا ہے کہ کلو کو گوری سے محبت تھی لیکن گوری کے باپ گھورے کو کلو سے سخت نفرت تھی، چنانچہ جب کلو فوج میں بھرتی ہو کر لام پر چلا گیا تو اس کی غیر حاضری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے گھورے نے گوری کی شادی جھبو سے کردی اور کلو جب واپس گاؤں آیا اور اس نے گوری کو جھبو کے بچوں کی ماں پایا تو وہ گاؤں کے سب سے اونچے درخت سے چھلانگ مار کر خس کم جہاں پاک ہوگیا ۔ تو اس افسانے کو یوں شروع کرو۔

" کلو مر گیا! کیا واقعی کلو مر گیا؟ ہاں ہاں اسے مرجانا ہی چاہیئے تھا: وہ یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا.... (یہاں گوری کا حسن اور جھبو کی بدصورتی کا ذکر بالتفصیل آجانا چاہیئے) کلو کا جنازہ اٹھا تو سب سے آگے جھبو تھا جو کلو کے بڈھے باپ کو سہارا دے رہا تھا اور سب سے پیچھے گوری تھی جو اپنے سب سے چھوٹے بچے کو سینے سے چمٹائے موقع اور محل سے بے پرواہ اپنا فرض مادری ادا کررہی تھی اس آخری حصہ کو بیان کرنے کے بعد ابتدائی حصے کو درمیان میں لاؤ۔

بیس سال ہوئے جب پاجی پور کے چھوٹے سے گاؤں میں ایک دبلی اور گوری لڑکی (گوری) اور ایک کالا اور موٹا لڑکا (کلو) ایک ساتھ مویشی چرانے جایا

کرتے دیہاں کئی ارمان انگیز مناظر اور مکالمے ضرور آجانا چاہئیں تاکہ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں افسانے کو خشک نہ سمجھیں اور بڑھے ناظرین افسانہ نگار کو برا بھلا کہتے جائیں لیکن افسانے کو ختم کیے بغیر نہ چھوڑیں .....) اور پھر ایک روز ایک حد درجہ گرم دوپہر میں کلو کو محبت ہو گئی گوری سے اور ان دونوں نے چنار کے ایک جھنڈ میں ایک ببول کے درخت کو گواہ بنا کر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ شامل سل ہو جانے کا عہد کر لیا۔"

سب سے آخر میں درمیانی حصے کو یوں گھسیٹو

"کلو اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی گٹھری لئے گوری کے دروازے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی گود میں ایک موٹا سا کالا بچہ لدا ہوا مچل مچل کر اس کے بال نوچ رہا ہے۔ پاس ہی ایک دوسرا اسٹنڈ ا لڈ کا اکڑوں بیٹھا محکمہ صحت اور صفائی کے ناموس پر بٹہ لگاتے ہوئے "اماں ہمیں دھلا دو!" چیخ رہا ہے۔ کلو نے یہ منظر دیکھا تو چیخ مار کر بھاگا اور بڑی بیاکھگی سے گاؤں کے سب سے اونچے درخت پر چڑھنے لگا ......

خوش قسمتی سے ہمارے افسانوں میں کردار نگاری پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا کیونکہ تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زیادہ تر کردار بدکردار ہوا کرتے ہیں بس اتنا یاد رکھنا کافی ہے کہ جو اچھا ہے وہ ضرورت سے زیادہ اچھا ہے اور جو برا ہے وہ ضرورت سے زیادہ برا ہے۔ عاشق صادق ہمیشہ خوب صورت، غریب اور ضرورت سے زیادہ باتونی ہوتا ہے۔ عاشق کاذب ہمیشہ بدصورت۔ جاہل اور بڑا عاقبت نااندیش ہوتا ہے۔ معشوق کا حسن شہرہ آفاق لیکن کردار مشتبہ اور اس کے باپ کا کردار بیشتر قابل دست اندازی پولیس ہوتا ہے ان مسلمات کو سامنے رکھ کر تم کوئی بھی افسانہ لکھ مارو گے تو افسانہ شائع کرنے والے رسالے کی چاہے اشاعت

بند ہو جائے لیکن ضمانت ہرگز ضبط نہ ہوگی۔"

منظر نگاری کے متعلق صرف یہ اشارہ کر دینا کافی ہے کہ جو لوگ منظر نگاری جانتے ہیں وہ اس سے دور دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو لوگ نہیں جانتے ہیں وہ اس خندق میں ڈبکی ضرور لگاتے ہیں۔ منظر نگاری کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار غیر شعوری طور سے اپنے ناظرین کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ناظرین اس کو شعوری طور سے حواس باختہ سمجھنے لگتے ہیں۔ جب وقت کوئی معقول بات سمجھ میں نہ آرہی ہو اس وقت اکثر منظر نگاری سے تھوڑا بہت کام نکل جاتا ہے مثلاً

"ٹوٹو جیپسٹ سر جھکائے خاموشی سے چلا جا رہا تھا اس وقت بڑی کوشش کے باوجود اس کے دماغ میں کوئی خیال نہیں آرہا تھا ——————

اودے اودے بادلوں کے نیچے بڑے بڑے گراں ڈیل ٹیلے اس طرح کھڑے تھے جیسے کسی الف لیلی کے بادشاہ کے فیل خانے کے ہاتھی باہر نکال کر آراستہ کر دیئے گئے ہوں۔ ان ٹیلوں پر چیر کے لانبے درخت بڑے والہانہ انداز سے جھوم جھوم کر سرگوشیاں کر رہے تھے اور ان کے پتوں سے سورج کی نرم و نازک کرنیں اس طرح جھانک رہی تھیں جیسے بہت سی نئی نویلی دلہنیں شب عروسی کے بعد آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی ہوں۔ اس دلفریب منظر کو دیکھ دیکھ کر گل بشبو کے شوخ و شنگ پھول بڑی معنی خیز اداؤں سے مسکرا رہے تھے......" وغیرہ وغیرہ۔

افسانوں کے پلاٹ کے متعلق کچھ زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بنے بنائے فرمے بازار میں ملتے ہیں ع اور لے آئے بازار سے اگر ٹوٹ گیا۔ افسانوں کا مقبول ترین موضوع محبت ہے۔ مغربی ممالک میں محبت ایک مثلث ہوتی ہے جس کا ایک کونا عاشق صادق دوسرا کونا عاشق کاذب اور تیسرا کونا معشوق ہوتا ہے

لیکن ہمارے دیس میں محبت تکونی نہیں بلکہ چوکور ہوتی ہے۔ تین کونے تو عاشق صادق، عاشق کاذب، اور معشوق ہوتے ہیں اور چوتھا کونا معشوق کا باپ ہوتا ہے اور زیادہ تر پالی اسی کونے پر مرتا ہے۔

محبت کے افسانے چند بندھے ٹکے محوروں پہ گھومتے رہتے ہیں۔ محبت ہوئی۔ رکاوٹیں پڑیں یا غلط فہمیاں ہوئیں۔ رکاوٹیں اور غلط فہمیاں دور ہو کر شادی ہو گئی تو واہ واہ اور نہیں دور ہوئیں اور دونوں فریقین بھٹکتے رہے تو آہ! آہ! محبت عموماً ایک سی سا ہوتی ہے عاشق بے وفا ہو جاتا ہے تو معشوق باوفا نکل آتا ہے۔ ایک پلڑا جھکتا ہے تو دوسرا پلڑا اٹھ جاتا ہے۔ عاشق رئیس زادہ ہے تو وہ کسی غریب معشوق کی عصمت مٹی میں ملا دیتا ہے۔ معشوق رئیس زادی ہے تو وہ عاشق کو پرانے جیلوں کی طرح گھر سے باہر پھکوا دیتی ہے غرضکہ کافی اچھل پھاند رہتی ہے اور اس سارے کھیل میں معشوق کا باپ کسی سر پھرے جوکر کی اداکاری کرتا رہتا ہے۔ پھر گھر بس گیا تو عاشق و معشوق دونوں خوش اور گھر اجڑ گیا تو افسانہ نگار خوش۔ ناظرین بہر صورت قابل رحم ہی نظر آتے ہیں۔

افسانہ لکھنے کے متعلق میں تمہیں ایک "جملہ حقوق محفوظ" والی ترکیب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم "ایشیا کے سب سے بڑے فن کار" "آتش رقم" اور "جادو نگار" افسانہ نگار بننا چاہتے ہیں تو تمہیں اپنی تشبیہوں اور استعاروں پر خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تشبیہ جتنی غیر مانوس اور بے ڈھنگی ہوگی اتنی ہی نادر الوجود سمجھی جائے گی مثلاً معشوق کے ماتھے کی بندی کو انجن کی سرچ لائٹ سے تشبیہ دو۔ اس کے گھونگھر والے بالوں کو کسی مل کی چمنی سے نکلنے والے دھوئیں پر چسپاں کر دو۔ اس کے دلربا جسم کے مختلف ولولہ انگیز اتار چڑھاؤ کو بیان کرنے کے لئے علم جغرافیہ یا محکمۂ آثار قدیمہ کی بعض اصطلاحات سے کام

لو۔ رقیب روسیاہ کے چہرے کو کسی مکان کی چھت سے پھینکے ہوئے تربوز سے بھڑا دو۔ تربوز کے لال گودے سے رقیب روسیاہ کی بے نوشی بھی آشکار ہو جائے گی اور تربوز کے کالے بیجوں سے اس کے گندے دانت بھی خندہ دنداں نما کی ایک عبرت انگیز تفسیر بن جائیں گے۔ معشوق کے خشمگیں والد کو کسی بوسیدہ اور پرشور لاری سے مناسبت دو۔ عاشق کے سراپا کو کسی چھوٹے سے اصیل مرغ سے لڑا دو وغیرہ وغیرہ۔

ایک بڑا افسانہ نگار کردار اور پلاٹ سے زیادہ افسانے کے ماحول پر زور دیتا ہے۔ اگلے وقتوں میں اسے عبارت آرائی کہتے تھے لیکن اب اسے سحر طرازی کہا جاتا ہے اور عرف عام میں بات کا بتنگڑ بنانا سمجھا جاتا ہے۔ اگر صرف یہ کہنا ہے کہ ہیروئن صوفے پر بیٹی ہیرو کا انتظار کر رہی تھی۔ دفعتاً کھڑکی کے باہر آہٹ ہوئی اور اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی تو اس کو چبا چبا کر یوں کہو۔

" وہ صوفے پر بیٹی انتظار کر رہی تھی ــــ یہ وہی صوفہ تھا جو پرانی ارماں انگیز داستاں کے بوجھ سے از کار رفتہ ہو چکا تھا اور جس کا ایک ایک اسپرنگ ساز فریادی بن چکا تھا (یہاں کمرے کی تاریخی اہمیت اور اس کے فرنیچر کی بوسیدگی پر ایک مقالہ لکھ ڈالو تاکہ ماحول انگیزی میں کوئی کسر باقی نہ رہے) ہاں تو وہ صوفے پر بیٹی انتظار کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کے قریب چند مچھر کچھ اس ترنم سے بھنبھنا رہے تھے جیسے کسی دور افتادہ جزیرے پر کوئی غریب الوطن شہزادہ سارنگی بجا رہا ہو۔ اس نے وہی لال کنارے والی نیلی ساری پہن رکھی تھی (یہاں کوئی تاریخی واقعہ چسپاں کر دو) دفعتاً اس نے کھڑکی کے باہر ایک آہٹ سنی! آہٹ! کیا وہ آگیا؟ وہ ایک پرکیف چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی اور انگڑائی لیتی ہوئی بند کھڑکی کی طرف بڑھی۔ کھڑکی کے شیشے ٹوٹ

پچکے تھے اور ان میں دفتی کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ اس نے کھڑکی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن پھر رک گئی۔ کھڑکی کے باہر پھر ایک التجا آمیز آہٹ ہوئی۔ کیا وہ کھڑکی کھول دے؟ کھول ہی دے؟ نہیں نہیں اس کھڑکی کے پیچھے اس کی ناموس ہے۔ عزت ہے۔ عصمت ہے۔ اس کے بڈھے باپ کی لمبی ناک ہے۔ اس کے خاندان کی اونچی پگڑی ہے! وہ سوچنے لگی۔ لیکن بالآخر اس نے کھڑکی کھول ہی دی!"

اب یہاں فوراً مت بتاؤ کہ کھڑکی کے باہر کیا تھا۔ ماحول انگیزی بلکہ سحر طرازی کا اصل موقع اسی وقت ہاتھ آتا جب پڑھنے والے کو افسانے میں کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کم سے کم مطلب ادا کرنا چاہیئے بلکہ سرے سے کوئی مطلب ہی نہ ہو تو کیا کہنا؟ زور قلم اور زیادہ!

" وہ کھلی ہوئی کھڑکی کا پٹ پکڑ کر سوچنے لگی آہ! میں کتنی اکیلی ہوں؟ بالکل اکیلی! اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ اس اکیلے پن کی وجہ سے میں نے سب کچھ کھو کر سب کچھ پالیا۔ نہیں! نہیں! نہیں! سب کچھ کھو کر کچھ بھی نہیں پایا۔ میری زندگی کا جھولا، زمانہ کی سردھری کے برگد میں ٹنگا ہوا ہے اور جھولتے جھولتے وہ برگد کی ایک بہت اونچی شاخ میں کچھ اس طرح اٹک کر رہ گیا ہے کہ میری زندگی بلکہ میں خود برہنہ ہو کر رہ گئی ہوں!"

" پھر آہٹ ہوئی!

" اس نے کھڑکی سے جھک کر باہر دیکھا۔

" ایک دم کٹا سیاہ کتا ایک باسی ہڈی کو توڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا!

" وہ ایک دہشت ناک چیخ مار کر اوندھے منہ صوفے پر گر پڑی اور بے اختیارانہ بڑبڑائی، اف یہ تنہائی ـــ یہ ایک بےکنار پیداکنار ہے جس کی طوفان خیز

لہروں میں اس طرح ڈوب رہی ہوں جیسے کشمیر کے زعفران زاروں پہ سنہری دھوپ
پھیلتی چلی جارہی ہو۔ اُف یہ تنہائی جسے مایوسی نے جنم دیا اور جسے مجبوری اپنی گود میں
پال رہی ہے (یہاں منظر نگاری کے کچھ مزید جوہر دکھاؤ) اس کی بڑبڑاہٹ سے پاس
کے کمرے میں اس کا باپ جاگ پڑا اور وہ ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر کھانستا ہوا
آن پہونچا۔ کھلی کھڑکی دیکھ کر وہ سمجھ گیا! سب کچھ سمجھ گیا۔۔ وغیرہ۔

پیارے بھتیجے یہ طویل خط ہو جانے کے باوجود افسانہ نگاری خصوصاً محبت
بھرے افسانوں کی ٹکنیک پہ پوری طرح حاوی نہیں ہو سکا ہے۔ بہرکیف امید ہے
کہ تم اس تھوڑے لکھے کو بہت جانو گے اور اگر تم اس سال ہائی اسکول کے امتحان
میں پھر فیل ہو گئے اور کسی اخبار کے دفتر کے چپراسی نہ بن سکے تو افسانہ نگار ضرور
بن جاؤ گے۔

راقم
تمہارا چچا

بھوت بھاگ گئے

جب کبھی میں اپنی زندگی کے ایسے حادثوں کا جائزہ لیتا ہوں جن میں طویلے کی بلا بندر کے سر، کے انداز پر مجھے مفت کی چوٹ کھانا پڑی تھی تو مجھ پر یہ حیرت انگیز لیکن پر لطف انکشاف ہوتا ہے کہ اس قسم کی حماقتوں کا سلسلہ، نصب میرے حریفوں کی ریشہ دوانیوں سے نہیں بلکہ میرے دوستوں کی کرم فرمائیوں سے ملتا ہے اور مجھے بیاختہ مرزا غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے

ے یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے!!
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

کچھ دنوں سے ہمارے محلے میں بھوتوں نے بڑا اُدھم مچا رکھا تھا۔ ہر تیسرے چوتھے دن ان کی ستم ظریفوں کا کوئی نت نیا واقعہ سننے میں آتا۔ کبھی جھنڈے خاں ایک ایک بات پر دس دس گالیاں دیتے اور قسمیں کھاتے سنائی پڑتے کہ ایک ناشدنی بھوت چھپکلی کی شکل اختیار کر کے ان کی بہو کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ غریب گھر میں جہاں بھی جاتی یہ بھوت دیوار یا چھت میں چپکا نظر آتا ہے اور جب خاں صاحب اپنی وہ تاریخی اور موروثی لاٹھی لے کر جس نے ہلاکو خاں کی تلوار سے زیادہ میدان سر کئے تھے، اس پر حملہ آور ہوتے ہیں تو وہ غائب ہو جاتا ہے اور خاں صاحب دانت پیتے صرف یہ کہتے رہ جاتے ہیں، "نکل، تو آسامنے اگر بڑے باپ کا ہے تو!" لیکن شاید بھوتوں کے بڑے باپ ہوتے ہی نہ چھوٹے!

کبھی کچوری مل ناک بسورتے ہوئے ملتے۔ "ہائے رام کیا غضب کر دیا کل اس بھوت کے بچے نے۔ رام آسرے حلوائی کے یہاں سے ناشتے کے لئے آدھ سیر گرما گرم امرتیاں لایا تھا۔ جلدی میں دونا منڈیر پہ رکھ کر میں نل کے نیچے نہانے بیٹھ گیا۔ پلک جھپکاتے نہا کر اٹھا تو دیکھا کہ دونا غائب تھا۔" اور اس کے بعد وہ ایک ایسا حسرت ناک چٹخارا لگاتے کہ سننے والوں کو کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے خود ان کے منہ سے کسی نے گرما گرم امرتی نکال لی ہو۔

کبھی نصیبن بوا سسکیاں بھر بھر کر بیان کرتیں کہ لال کنوئیں کے پاس گلی میں وہ مٹی کا تیل لینے جا رہی تھیں کہ اچانک ایک اندھیری نکڑ پہ سفید کفنی پہنے ایک بھوت ان پر خوخیا دوڑا تھا۔ اور ان کی چیخ پر وہ ان کا نیا بٹوا جس کو انھوں نے تھوڑی ہی دیر پہلے ڈلی اور تمباکو سے بھرا تھا، اور جس میں ان کی چونی بھی پڑی تھی، اچک کر نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔

اسی صورت سے سارے محلے پر بھوتوں نے ایک گھیرا سا ڈال رکھا تھا اور ان کی ہمت یا پاجی پن اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اس سے نتھو، بدھو، کھگا وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا مولانا فروغ اللہ کے دانتوں کی چاپ اور پنڈت بدھو رام کی دھوتی اور چنبیلی بائی جن کی حیثیت جملہ معترضہ کی سی ہوتے ہوئے بھی محلے میں کافی اہم تھی، کا سینڈل تک بھی محفوظ نہیں رہ گیا تھا۔

بھوتوں کی اسی فصل میں ایک روز میں لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا اور آسمان بادلوں سے لدا کھڑا تھا۔ میں اپنا کام نپٹا کے چار بجے کی بس سے سندیلہ لوٹ جانا چاہتا تھا لیکن شائستہ اعمال کہ امین آباد میں ڈکٹشت جی مل گئے وہ میرے ارادے سے سخت اختلاف کرتے ہوئے بولے "اجی ایسی بھی کیا آگ لگی ہوئی ہے دو تین چیزیں اور خرید لوں تو پھر ساتھ ہی چلتے ہیں۔"

خرید نا انھیں دو تین ہی چیزیں تھیں لیکن ان کے خریدنے کے سلسلہ میں انھیں نے نہیں معلوم کتنی دکانیں جھانک ڈالیں اور کتنے دکانداروں سے مول تول کے سلسلے میں وہ تو، تو، میں میں اور غل فش کی کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ان کے اور میرے پیچھے نہ صرف چند تماشائیوں کا ایک چھوٹا سا غول بلکہ ایک کانسٹبل بھی چل رہا ہے۔ میں نے انھیں اس خطرے سے آگاہ کیا تو ان کے ہاتھ پاؤں اور بھی پھول گئے۔ خدا خدا کر کے بیسوں دکانوں سے نمونہ چکھنے یا دیکھنے کے بعد انھوں نے اپنی شریمتی جی کے لئے پاؤ بھر حلوہ سوہن۔ بھاوج کے لئے چند تولے کلاتو اور اپنے سب سے چھوٹے بچے کے لئے گز بھر جالا سے ایک عدد لٹو خرید ہی ڈالا اس خرید و فروخت میں اور خصوصاً لٹو نچوانے اور نچا کر دیکھنے میں انھوں نے اتنا وقت خراب کر دیا کہ ساڑھے چھ بج گئے اور اسی وقت تیز بارش بھی آ گئی۔ کافی تلاش اور خوشامد کے بعد ایک رکشا ملا اور ہم بھیگتے بھاگتے بس اسٹینڈ پہونچے۔ آخری بس چھوٹنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔ موسم کی خرابی کے باعث وہ قریب قریب خالی تھی۔ دس منٹ کے بجائے گھنٹہ بھر بعد وہ چلی تو اس میں ہم لوگوں کو ملا کر صرف بارہ تیرہ مسافر تھے۔

ہمارے ڈکشت جی کھائے پئے بغیر تو چند گھنٹے زندہ رہ سکتے ہیں لیکن باتیں کئے بغیر تھوڑی دیر بھی زندہ رہنا ان کے لئے محال ہے۔ بس چلی تو ان کی زبان بھی چلی اور چونکہ ان دنوں ان کے اعصاب پر بھوت اور صرف بھوت سوار تھے لہٰذا ان کی گفتگو بھوتوں ہی کے متعلق تھی ــــ وہ اپنے پاس بیٹھے ایک قحط زدہ اور مسکین صورت مسافر کو تختۂ مشق بنائے اس کو اپنے محلے کے بھوتوں کی ہوشربا داستانیں حسب ضرورت بلکہ بلا ضرورت نمک مرچ لگا کر سنا رہے تھے۔ وہ بیچارا مختصر سا انسان بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے درمیان موسلا دھار بارش اور اندھیری

رات میں سنسان راستے پر کھڑ کھڑاتی بس کے اندر یوں ہی بھوچکا بیٹھا تھا، اس پر اسے جو انتہائی بھیانک اور لرزہ خیز قصے ایک سے بڑھ کر ایک سنائے گئے تو اپنے ہوش و حواس سے بالکل ہی استعفیٰ دے بیٹھا۔ وہ بس رکوا کر اگلے حصے سے پچھلے حصے میں منتقل ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دو اور مسافر بھی جو ڈکشت جی کی گفتگو سن رہے تھے ان کو غصے اور نفرت سے گھورتے ہوئے اس کے ساتھ پیچھے چلے گئے۔

اب بس کے اگلے حصے میں صرف چار مسافر رہ گئے ڈکشت جی اور میں اور ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے ایک لمبی ڈاڑھی والے باباجی اور ان کا ایک سر گھٹا چیلا جس کو وہ ایک دفعہ بلّو کہہ کر پکار چکے تھے۔

ڈکشت جی کچھ دم لینے کے لئے رکے تو بلّو نے باباجی کو مخاطب کیا۔

"باباجی! اسی شہر لکھنؤ میں تو آپ نے حسین صاحب کی بیوی کا بھوت اتارا تھا۔"

باباجی مالا جپ رہے تھے لہٰذا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب بلّو نے ڈکشت جی کو مخاطب کیا "ہمارے باباجی چٹکی بجاتے بھوتوں کو زیر کر لیتے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو ان کی صورت دیکھتے ہی بھوت بھاگتا ہے۔"

باباجی نے ہاتھ کے اشارے سے بلّو کو روکا مگر کچھ اس انداز سے جیسے کہہ رہے ہوں "کیوں بے وقوفوں کے سامنے عقلمندی کی باتیں کر رہا ہے۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! ڈکشت جی کے لئے اتنا اشارا ضرورت سے زیادہ کافی تھا۔ انھوں نے باباجی کو براہ راست مخاطب کیا " باباجی! ہمارے محلے کو آج کل بھوتوں نے اپنی راجدھانی بنا رکھا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا جو کوئی نیا شگوفہ نہ کھلاتے ہوں۔ ہم محلے والوں نے میونسپلٹی کو درخواست دے

رکھی ہے کہ اگر کچھ دنوں اور یہی حالت رہی تو ہم سب محلہ چھوڑ کر کسی جنگل کی طرف
نکل جائیں گے۔ جان ہے تو جہان ہے!"
قبل اس کے کہ باباجی کچھ بولیں بلّو پوچھ بیٹھا "پھر کیا جواب دیا میونسپلٹی
نے؟" "جواب کیا دیتی؟" ڈگشت جی نے کہا "مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔
لاٹیکس! اس نے لکھا کہ بھوت دور کرنے کا ہمارے یہاں کوئی محکمہ اب تک
نہیں کھلا ہے لہٰذا بھوتوں سے آپ لوگ خود نپٹیئے۔ البتہ اگر آپ لوگ محلہ چھوڑ
رہے ہوں تو پہلے واٹر ٹیکس بے باق کر دیجئے ورنہ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی"
باباجی نے مسکرا کر اور اپنا مالا جیب میں رکھ کر پہلی دفعہ منہ کھولا "آپ
لوگوں نے بھوتوں کو مذاق سمجھ رکھا ہے کیا؟ آپ کے محلے میں جو تماشے ہوتے رہتے
ہیں وہ محض آپ لوگوں کے واہمے ہیں اور کچھ مسخروں کے کرتوت"
"ہم لوگوں کے واہمے اور مسخروں کے کرتوت! باباجی یہ آپ کیا فرما رہے
ہیں؟ مختلف شکلوں میں بھوتوں کو ایک دو نے نہیں بیسوں آدمیوں نے خود
اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" ڈگشت جی نے فریاد کی۔
باباجی نے رحم آمیز محبت سے ڈگشت جی کو دیکھتے ہوئے کہا "برخوردار
بھوت بڑا خطرناک ہوتا ہے بڑا خطرناک! ابھی اس سے آپ لوگوں کا واسطہ ہی
نہیں پڑا ہے۔ آپ کے محلے میں واقعی بھوت ہوتا تو آج آپ اس طرح اس بس
میں بیٹھے باتیں نہ کر رہے ہوتے۔ آپ کے محلے میں اگر ہوں گے تو بھوت نہیں
کچھ چھوٹی نسل کی بھتنیاں ہوں گی جو صرف نقصان پہنچاتی ہیں مارتی اور جان
نہیں لیتی ہیں"
باباجی اور ڈگشت جی کے درمیان بھوتوں کی نسل اور کارناموں پر بہت تفصیل
سے تبادلۂ خیال ہونے لگا اور اس کے درمیان میں کچھ اونگھ سا گیا۔ آخر میں ڈگشت

جی نے گڑگڑا کر کہا "باباجی! اس وقت آپ کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ چند گھنٹوں کے لئے ہمارے قصبے میں اتر پڑیں؟"

باباجی نے بڑی بے نیازی سے فرمایا "آپ مجھے اب اس وقت اور اس موسم میں نہ روکیے۔ دلیل نگر کے ٹھاکر مکندی سنگھ ایک بڑے خطرناک بھوت کے چنگل میں پھنس گئے ہیں۔ انھوں نے بلّو کو خاص کر مجھے بلانے کے لیے بھیجا ہے میں اس وقت وہیں جا رہا ہوں۔"

لیکن بھلا ڈکشت جی کب ماننے والے تھے۔ وہ سر ہو گئے اور انھوں نے طرح طرح کی خوشامد سے باباجی کو آخر میں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ صرف رات بھر کے لئے ہمارے قصبہ میں اتر پڑیں اور سویرا ہوتے ہی پہلی بس سے دلیل نگر چلے جائیں۔"

سندیلہ میں بس رکی تو کافی تیز بوندا باندی ہو رہی تھی۔ تھوڑے فاصلے پر درخت کے نیچے چند رکشے کھڑے تھے۔ ڈکشت جی انھیں بلانے روانہ ہو گئے ان کے جانے کے ایک دو منٹ تک آنکھیں بند کر کے مکمل طور سے خاموش رہنے کے بعد باباجی نے مجھے حکم دیا "اپنے ساتھی کو بلا لاؤ۔ مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ٹھاکر مکندی لال کی حالت زیادہ خراب ہے لہٰذا میں رک نہیں سکتا۔"

میں سہم گیا اور بس سے اتر کر فوراً بھیگتا اور دوڑتا ڈکشت جی کو بلانے چلا گیا۔"

رکشے پر بیٹھے ہم دونوں جب واپس آئے تو بس میں اللہ بس باقی ہوس کا مضمون تھا۔ نہ باباجی تھے اور نہ بلّو اور نہ ڈکشت جی کا اٹیچی کیس اور نہ میرا جھولا، چھتری اور ٹرانسسٹر۔

دوسرے روز سویرے ہم لوگ ٹہلنے نکلے تو بس اسٹینڈ کے پاس ایک

باغ میں ایک مصنوعی داڑھی پڑی ہوئی ملی۔ ڈکشٹ جی مالِ غنیمت سمجھ کر اسی کو اٹھا لائے تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت پر کام آئے۔ اور غالباً اسی داڑھی کی برکت سے اب ہمارے محلے کے سارے بھوت بھاگ چکے ہیں۔ ڈکشٹ جی کا پختہ یقین ہے کہ باباجی خود نہیں بھاگے ہیں بلکہ ٹیپو کی سازش سے، بھوت ان کی داڑھی نوچ کر انھیں کہیں اغوا کر لے گئے ہیں۔ بہرحال وہ کہیں بھی ہوں میرا جی ٹرہینے ٹرانسسٹر سن رہے ہوں گے!۔

ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

———— ⁂ ————

رہبر

اصلاح رسوم کے ایک جلسہ میں محلے کی خواتین کی فرمائش پر بابو چھیدی لال
گپتا ممبر اسمبلی نے جہیز کی مخالفت میں جو پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی وہ واقعی
سننے کے لائق تھی۔ تقریر میں خیالات ضرور کچھ الجھے ہوئے تھے، سیاسی رہنماؤں کی
گفتار میں یہ خصوصیت عام طور پر پائی اور ان کی عالی دماغی کی دلیل سمجھی جاتی ہے ۔۔۔
تسلسل کی کمی کے ساتھ الفاظ بھی کچھ آڑے ترچھے تھے لیکن اس سے خلوص کچھ ایسا
پھوٹ پھوٹ کر برس رہا تھا کہ ایک ایک جملے پر حاضرین (جن میں نوجوان خواتین
کی اکثریت تھی) نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے اور تالیاں بجانے پر مجبور سے ہو رہے تھے۔
گپتا جی بڑے تکلف سے کھڑے تو ہوئے تھے صرف پندرہ منٹ بولنے کے لئے لیکن
ڈیڑھ گھنٹہ متواتر تقریر کرنے کے بعد جب صدر جلسہ نے گھنٹی بجا بجا کر ان کا ناک میں
دم کر دیا تو انہیں بادل ناخواستہ بیٹھ ہی جانا پڑا۔ ان کی تقریر کا آخری حصہ بڑا رقت
انگیز تھا۔ اسی لئے جہاں پنڈال نعروں اور تالیوں سے گونج رہا تھا وہاں بعض گوشوں
سے دبی چیخوں اور سسکیوں کی بھی آوازیں آنے لگی تھیں۔

وہ گرجے، بلکہ یوں سمجھئے کہ بدستور گرجتے ہوئے چیخے "میں کہتا ہوں، پھر کہتا ہوں
جی ہاں اپنی پوری طاقت سے کہتا ہوں کہ جہیز ایک نحوست، ایک لعنت بلکہ ایک ہلاکت
خیز وبا ہے (تالیاں) ہماری کتنی جوان بہنیں اور بیٹیاں ہیں جن کی مانگیں صرف اس
وجہ سے سیندور سے خالی ہیں کہ ان کے والدین ان کے ہونے والوں رشتوں کے

لئے مونہہ مانگے جہیز کا انتظام نہیں کر سکتے۔ آخر ان معصوم اور مظلوم بچیوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کس کی گردن پر ہے؟ (نعرہ ہائے شرم!) آج کتنے والدین ہیں جو صرف اپنی بیٹیوں کو جہیز دینے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے! دانے دانے کو محتاج ہو گئے! کتنی بے ہودہ، کتنی حیا سوز اور کتنی عبرت انگیز ہے یہ بات کہ ایک باپ اپنی لڑکی کی شادی کا سودا کرنے کے لئے ایک ایک گھر پر جا کر گڑگڑاتا اور ناک رگڑتا ہے (بابو چھیدی لال گپتا زندہ باد کے نعرے!) ہمارے سماج میں آج صرف جہیز کی حماقت کے باعث عورت کو ذلت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت صرف ایک غلام کی سی ہے، ایک ایسے غلام کی جو اپنی غلامی کی قیمت خود ادا کرتا ہے! (نعرہ ہائے شرم!) سرکار نے جہیز کے خلاف قانون بھی بنا دیا ہے لیکن جب تک ہمارے دلوں میں کھوٹ اور ہماری نیت میں فتور رہے، ہمیں قانون سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور ہم بلکہ ہماری پوری قوم جہیز کے نیچے بدستور سسکتی اور بلکتی ہی رہے گی۔ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ ہم سے کچھ غیرت مند، کچھ انصاف پسند، کچھ پرخلوص کام کرنے والے اٹھیں، کمر ہمت کسیں......"

گپتا جی کا جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ سارا پنڈال تالیوں اور "بابو چھیدی لال گپتا زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ جناب صدر جو گھنٹی بجا رہے تھے اب مسلسل گھنٹی بجانے لگے تھے۔ گپتا جی مجبوراً ہانپتے ہوئے جناب صدر کی کرسی کے پاس ہی پڑے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔

گپتا جی کی تقریر سے کشور بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے پورے امین آباد کے دو چکر لگائے اور طرح طرح کے موضوعات چھیڑے لیکن اس پر جہیز کی رسم کو ملیا میٹ کر دینے کا جوش اور جذبہ بری طرح حاوی تھا۔ وہ کوئی دوسری بات کرنے کے بجائے بار بار گپتا جی کی تقریر کے فقرے دہرا رہی تھی اور

ان پر اپنی جانب سے کچھ اس قسم کے حاشیئے بھی لگاتی جاتی۔ "ہاں! سچ ہی تو کہہ رہے تھے گپتا جی!" "کتنی دل کو لگتی بات کہی گپتا جی نے! گپتا جی نے واقعی ہمارے سماج کی ایک بڑی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی یہ کہہ کر!" وغیرہ وغیرہ۔ اور جب میں نے کہا "ہاں جہیز کی لعنت تو دور ہی ہونا چاہیئے لیکن اس وقت ہندوستان کو صرف چھوٹی چھوٹی سن سمجھوتے والی اصلاحوں کی نہیں بلکہ ایک زبردست ذہنی سماجی اور اقتصادی انقلاب کی ضرورت ہے۔" تو وہ کچھ بگڑ سی گئی "ہاں عام مردوں کو اس کی کیا فکر کہ جہیز کی وجہ سے کتنی بے زبان کنواریوں کو کیسی کیسی ذلتوں اور نفرتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات خود ان کے والدین ان کی موت کی دعائیں مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ گپتا کے ایسے دو دو سو بھی درد مند اور مظلوم دوست، کارکن نکل آئیں تو چٹکی بجاتے یہ جہیز کا طاعون ہمیشہ کے لئے دور ہو سکتا ہے۔"

آج گھر کا باورچی رخصت پر تھا لہٰذا پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق میں کشور کے ساتھ، اجے ہندر ریسٹوراں چلا گیا۔ رات کے دس بج چکے تھے، ریسٹوراں قریب قریب خالی تھا۔ ہم دونوں ایک کنارے والے کوپے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ اس کے اور دوسرے کوپے کے درمیان صرف ایک پردہ پڑا ہوا تھا دوسری جانب سے پہلے کچھ مدہم پھر دو آدمیوں کی صاف صاف آوازیں آنے لگیں اور ہم ان کے سننے پر نہ صرف مجبور بلکہ بعد میں کچھ ایسا محو ہو گئے کہ ہمارے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر سی لگ گئی۔

"دیکھئے بیس ہزار نقد کی بات کم سے کم ہے جو میں نے آپ کو بتادی ہے۔"

"لیکن آپ اس پر تو غور کیجئے کہ مجھے ابھی اپنی دو لڑکیوں کی اور بھی تو شادی کرنا ہے۔"

"لیکن میرے ایسے گھرانے میں ابھی تک کوئی بہو بیس ہزار نقد کا جہیز لیے بغیر نہیں آئی ہے۔"

"آپ بیس ہزار نقد فرماتے ہیں، چلیے سترہ ہزار نقد پر بات ختم کیجیے۔ مجھے اس نقد کے علاوہ شادی کے دوسرے ٹیم ٹام پر بھی تو سات آٹھ ہزار خرچ کرنا پڑ جائیں گے۔"

"معاف کیجیے گا آپ تو سبزی فروشوں کی طرح مول تول کرتے ہیں۔ میں ایک بات بیس ہزار عرض کر چکا ہوں۔ رہا شادی کا ٹیم ٹام اس پر ایک آپ کو کیا ہر شخص کو اپنی حیثیت اور نیت کے مطابق خرچ ہی کرنا پڑتا ہے۔"

"دیکھیے آپ تو بہت روشن خیال اور پڑھے لکھے انسان ہیں۔ جہیز کے نقد روپوں کے مطابق آپ کا اتنا اصرار کچھ مناسب نہیں ہے۔ کوئی باپ جب اپنی آنکھ کا تارا یعنی اپنی لڑکی دے دیتا ہے تو وہ دینے کو باقی ہی کیا چھوڑتا ہے۔ میری اتنی حیثیت ہوتی تو میں آپ کی بات ہرگز نہ ٹالتا۔ ان سترہ ہزار کا انتظام بھی میں بڑی مشکل ہی سے کر پاؤں گا۔"

"تو پھر بات ختم سمجھیے۔ یقین کیجیے گا ابھی پرسوں ہی اٹھارہ ہزار کا ایک رشتہ آیا تھا اور لڑکی بی اے بھی پاس تھی لیکن محض آپ کے رشتے کی وجہ سے دونوں کی ماں نے اُسے الٹا واپس کر دیا۔"

"آپ کی ایسی مقتدر ہستی سے تو مجھے یہ توقع تھی کہ آپ جہیز کے نقد روپوں کے متعلق میری حیثیت سے زیادہ ہرگز اصرار نہ کریں گے۔ آخر آپ کے سامنے بھی تو دو لڑکیاں ہیں۔"

"سچ پوچھیے تو میں ذاتی طور سے جہیز دیے جانے کی ہرگز موافقت میں نہیں ہوں اور حتی الوسع میں اپنی لڑکیوں کے لئے ایسے ہی رشتوں کی تلاش میں ہوں

جو جہیز کے متعلق ترقی پسند ذہنیت کے حامل ہوں۔ لیکن میں اپنے گھر والوں کو کیا کروں ونود، اس کے بڑے بھائی پرمود، اس کی ماں اور بہنوں سب ہی کی متفقہ رائے ہے کہ ونود، کی دلہن کم سے کم بیس ہزار نقد ضرور لائے۔ اب میرے جیسے جمہوریت پرست انسان کو مجبوراً اس اکثریت کے فیصلے کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔"

"تو پھر اس کا قطعی جواب میں آپ کو دو تین روز میں دے سکوں گا۔"

"معاف کیجئے گا، آپ مفت میں پس وپیش کر رہے ہیں اور صرف تین ہزار کی حقیر رقم کے پیچھے اپنی بیٹی کی زندگی خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ونود کا جیسا رشتہ بار بار ہاتھ نہیں آتا۔ پرمود کی شادی ہوئی تھی تو اس کی بیوی بیس ہزار نقد کا جہیز لے کر آئی تھی۔ اب ونود کی بیوی اس سے ایک پائی بھی کم جہیز لے کر آئے گی تو نہ صرف اپنی جیٹھانی بلکہ ساری برادری کے سامنے نکو بن کر رہ جائے گی۔ اور پھر آپ عورتوں کی زبانوں کو تو جانتے ہی ہیں وہ طعن تشنیع سے ہمیشہ آپ کی بیٹی کا کلیجہ چھلنی کرتی رہیں گی اور احساس کمتری کے باعث وہ کبھی ان سے آنکھیں چار نہ کر سکے گی۔"

"بہت اچھا! آپ نہیں مانتے ہیں تو مجھے بیس ہزار دینا منظور ہیں۔"

"مبارک ہو آپ کو! بس بات پکی ہو گئی۔ آپ روپیہ بھجوانے کی تاریخ مقرر کر دیجئے اور میں پنڈت جی کو بلوا کر شادی کی تاریخ اور دوسری تفصیلات طے کئے لیتا ہوں۔ لیکن روپیہ بھجوانے میں ذرا احتیاط کی ضرورت ہے، کیوں کہ ہمیں سرکاری قانون کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔"

"بہت اچھا! جیسی مرضی آپ کی۔"

"اچھا تو اب مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے نشہ بندی کمیٹی میں شرکت کے لئے کل سویرے ہی کی گاڑی سے مینی تال جانا ہے۔" اور یہ کہتا ہوا ایک شخص

دوسرے کوپے سے نکل گیا۔

کشور سے، جو مارے غصے کے لال پیلی ہو رہی تھی صبر نہ ہو سکا۔ اس نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو بابو چھیدی لال گپتا ممبر اسمبلی مسکراتے تیز قدموں سے باہر جارہے تھے۔
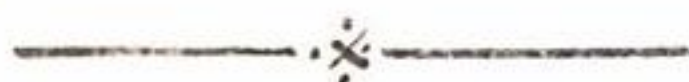
چچا گھوم پھر

مرزا بودم بیگ سارے محلہ میں "چچا گھوم پھر" کے نام سے یاد کیئے جاتے ان کا یہ لقب ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارا تھا کہ وہ ہر بات کو اتنا گھما' پھرا کر کہتے کہ سننے والوں کا سر چکرا جاتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کم سے کم مطلب بیان کرتے بلکہ اکثر بیان ہی نہ کرتے اور ان کا مخاطب ان کی صورت سے بیزار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ہوش و حواس سے بھی مایوس ہو جاتا۔

آدمی خلیق تھے۔ بات تو سیدھے منہ کرتے لیکن کبھی سیدھی بات نہ کرتے۔ مثلاً اگر کسی شامت کے مارے نے پوچھ دیا: "آج کون سا دن ہے؟" تو وہ یوں جواب دیتے "دیکھیئے پرسوں اتوار تھا اب پرسوں سے سات دن بعد پھر اتوار آئے گا۔ اس حساب سے دو دن بعد جمعرات ہو گی۔ کل دوشنبہ تھا اور کل جو آنے والا ہے بدھ ہو گا۔ اس وجہ سے آج قاعدے سے تو منگل ہونا چاہیئے لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ کوئی جنتری دیکھ لیں۔" اس کے بعد اگر سوال پوچھنے والا بھاگ نہ کھڑا ہوتا یا چکرا کر گر نہ پڑتا تو یہ وہ بھی بڑی تفصیل سے بتا دیتے کہ جنتری کہاں مل سکتی ہے؟ کون سی جنتری مستند سمجھی جاتی ہیں؟ وہ کہاں چھپتی ہیں؟ چھاپا خانہ کس نے ایجاد کیا تھا؟ کس قسم کے چھاپے خانوں میں کس قسم کے کاغذ استعمال ہوتے ہیں؟ ان کا بازار میں کیا بھاؤ ہے؟ جعلی نوٹ کس طرح چھاپے جاتے ہیں؟ اس جرم میں سب سے پہلا مقدمہ کس پہ چلا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

بچا گھوم پھر کی گفتگو کے وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے الفاظ کی لاٹھی بے تحاشہ چلاتے ہوئے اپنے مطلب کا پیچھا کر رہے ہوں اور وہ کسی ناشدنی دولتی مارنے والے گدھے کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہو۔ اتفاق سے کبھی تو وہ ان کی لاٹھی کی زد میں آجاتا اور کبھی اس کی دولتی سے وہ خود چاروں خانے چت ہو جاتے۔

ایک دفعہ ایک راہ گیر ان سے لالہ بھوپول کے مکان کا پتہ پوچھ بیٹھا تھا۔ انھوں نے بڑی شفقت سے فوراً جواب دیا " دیکھیے آپ اپنی ناک کی سیدھ پر بیت سر مکانات دیکھ رہے ہیں انھیں میں سے آٹھ دس مکانات کے بعد ایک مکان لال حویلی ہے۔ اس کے پاس سے پچھم جو گلی ہیبت خاں کے پچھواڑے سے ہوتی ہوئی گندے نالے کے برابر سے گئی ہے اس پر کوئی دو تین سو قدم جاکر دکھن جانب مڑ جائیے گا۔ آگے بڑھ کر آپ کو بھوندو حلوائی کی دوکان ملے گی۔ اس کے کتے سے ہوشیار رہیے گا۔ مگر وہ بھونکتا ہے کاٹتا نہیں۔ اس نسل کے سب کتوں کا یہی حال ہے۔ جی ہاں تو آپ کہاں تھے؟ بھوندو حلوائی کی دکان کے پاس! لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ اس سے چالیس پچاس قدم پیچھے ہٹ آیئے۔ یہاں آپ کو کئی گلیاں ملیں گی۔ دوسری یا تیسری گلی پر اتر کی طرف گھوم جائیے گا۔ پھر آنکھ بند کر کے بھی چلتے چلتے آپ سبزی منڈی پہونچ جائیے گا۔ وہاں کوئی نہ کوئی جان پہچان آپ کو ضرور ہی مل جلئے گا۔ وہ فوراً بتا دے گا کہ بھوپول کا مکان لال حویلی کے پورب ہے یا پچھم"

اس تقریر کے سننے کے بعد راہ گیر نے پاس ہی لگے نل کے نیچے کچھ دیر اپنے سر پر پانی تریرا اور پھر آگے بڑھنے کے بجائے الٹے پیروں لوٹ گیا اور پھر کبھی اس کی صورت محلے میں کسی نے نہیں دیکھی۔

لوگ " بچا گھوم پھر" سے بات کرتے گھبراتے بلکہ کنائی کاٹتے۔ آخر میں تو یہ نوبت آگئی تھی کہ دور سے ان کی صورت دیکھتے ہی وہ لاحول پڑھتے اِدھر اُدھر

ہو جاتے یا اپنے گھروں میں گھس کر دروازے بند کر لیتے اور چچا گھوم پھر سنسان سڑک پر کسی مرکھنے بیل کی طرح جھومتے ہوئے تن تنہا گذر جاتے اور کوئی شکار ان کے ہاتھ نہ آتا۔

اکثر وہ خود کسی کے گھر پر پہونچ جاتے اور ہانک لگاتے "اجی شمبھو دیال جی آپ انسان میرا مطلب ہے کہ دو پاؤں پر کھڑے ہونے والے جانور نہیں بلکہ بجلی کا کھمبا ہیں یعنی پشاخا معلوم ہوتے ہیں۔ جی ہاں میرے بچپن میں بجلی کے کھمبے نہیں بلکہ پشاخے ہوا کرتے۔ ایک دفعہ ایک بارات کے جلوس میں رمضانی باورچی کی دکان کے سامنے میرا ہاتھ بلکہ ہاتھ کی پانچ انگلیوں میں بیچ کی انگلی جو دوسری سب انگلیوں میں بڑی ہوتی ہے ایک پشاخے سے جل گئی تھی۔ جی ہاں تو آپ پشاخا اس وجہ سے دکھائی پڑتے ہیں کہ اس وقت نو بجے میں اٹھارہ منٹ باقی ہیں میں نے آج ہی ٹوما ٹائم سے جو ریڈیو پر بجتا ہے اپنی جیبی گھڑی ملائی تھی اور وہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور آپ ابھی تک اپنے بستر یعنی لحاف اور گدّے کے درمیان سے نہیں نکل پائے ہیں مطلب یہ ہے کہ غافل ہو کر بالکل ہی سو رہے ہیں۔"

شمبھو دیال جی فوراً ہی گھر سے برآمد ہو کر چچا گھوم پھر کے سامنے سے یہ کہتے ہوئے تیر کی طرح نکل جاتے ہیں۔ "آداب عرض ہے مرزا صاحب! معاف کیجئے گا آج اتوار کے روز دفتر میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے آٹھ ہی بجے بلایا تھا بلکہ مجھے بڑی دیر ہو گئی ہے لہٰذا رک نہیں سکتا۔" چچا ان کو قہر آلود نگاہوں سے ایسے تکتے رہ جاتے ہیں جیسے ہاتھ میں آیا ہوا شکار چھوٹ جائے اور شمبھو دیال جی یہ جا وہ جا نو دو گیارہ ہو جاتے، اور تھوڑی دیر کے بعد جب یقین ہو جاتا کہ وہ بلائے ناگہانی ٹل گئی ہو گی، پچھلی گلی سے دبے پیروں آکر خود اپنے گھر میں کسی چور کی طرح پھر گھس جاتے۔

ایک دفعہ چچا گھوم پھر ایک انجان نائی کی دکان پر جا پہونچے تھے۔ وہاں انہوں
نے اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھائے تو نتیجہ بہت ناخوشگوار نکلا۔ وہ بیچارا انہیں
معلوم نہیں ان کی بے سروپا باتوں سے کیا کا کیا سمجھا اور اس نے ان کا نہ صرف سر جس
پر بڑے بڑے پٹے تھے مونڈ کر رکھ دیا بلکہ ان کی چنگیز خانی چڑھی ہوئی مونچھوں
کا بھی صفا چٹ کر دیا۔ چچا بہت اچھلے کودے لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ مجبوراً
چچا وہ پندرہ دن کے لئے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے۔ محلے والوں نے کوشش کر کے
نائی کا پتا دریافت کیا اور اس کو جا کر بڑی شاباشی دی بلکہ بہتوں نے تو اس کے
کارنامے کی بنا پر اس کی مستقل سرپرستی کا بیڑا اٹھا لیا۔ سنتے ہیں کہ اسی طرح اپنی اوٹ
پٹانگ باتوں کی بدولت بہت دن ہوئے ایک دفعہ وہ ایک دنداں ساز کے یہاں
سے اپنی دکھتی ہوئی داہنی داڑھ کے بجائے اچھی بھلی بائیں داڑھ نکلوا آئے
تھے ......

ایک دفعہ محلے کے ایک زندہ دل بزرگ نے چچا گھوم پھر کو بہت دلچسپ
سبق دیا تھا۔ چچا اپنے گھر کے قریب ایک دکان کے سامنے کھڑے اپنے مخصوص
انداز میں دکاندار کو کچھ الٹی سیدھی نصیحتیں کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں وہی بزرگ
لپکتے جھپکتے آئے اور یوں گویا ہوئے: جناب مرزا بودم بیگ صاحب! بعد ادائے
آداب کے گذارش یہ ہے کہ یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم
سے نیک چاہتا ہوں۔ ابھی ابھی یعنی گیارہ بج کر ساڑھے چالیس منٹ پر یعنی بارہ
بجنے میں ساڑھے انیس منٹ کم پر، جب میں آپ کے دولت کدے کے سامنے سے کہ
وہ عین سڑک کے سامنے ہے گذر رہا تھا، کیونکہ یہ میرا معمول ہے کہ میں اس سڑک
پر اکثر گذرتا رہتا ہوں تو میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا، واضح رہے کہ چالیس
سال کا ہو جانے پر بھی میری بینائی میں آپ کی دعا سے ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا!

ہے کہ ایک عدد موٹے سیاہ کتے نے کہ جس کی عمر تین سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی آپ کے باورچی خانے کے دروازے کو دھکا دیا اور اس کے ایک پٹ بند رہ جانے کے باوجود دوسرا پٹ کھول کر اور غالباً آپ کی اجازت بغیر اس میں داخل ہو چکا ہے۔"

چچا گھوم پھر نے شاید زندگی بھر پہلی سیدھی بات کی۔ وہ بے اختیار ہو کر چیخے "اجی یہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میرے شاہی ٹکڑے اور بالائی!" چچا سر پہ پیر رکھ کر اپنے مکان کی طرف دوڑے لیکن کتا پہلے ہی سب کچھ صفا چٹ کر چکنے کے بعد بھاگ جا چکا تھا۔

چچا آج کل ایک نوزائیدہ سیاسی پارٹی کے مقرر خاص بنے ہوئے سارے صوبے کا دورا کر رہے ہیں اور واقعی "گھوم پھر" بن گئے ہیں۔ اور ہمیں پارٹی سے زیادہ ان کے سامعین سے ہمدردی ہے۔
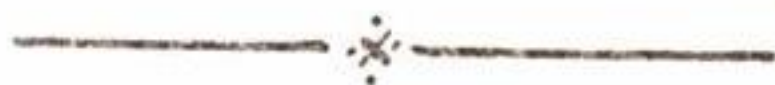
ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

ماہنامہ شب خون، الہ آباد میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے میری کتاب "دود کے ڈھیلے" اور پروفیسر مجوب بڑائی صاحب کی کتاب "ہم کہاں کے دانا ہیں" پر جو مشترکہ تبصرہ بلکہ شب خوں مارا اور اس طرح سے گویا ایک پتھر سے دو چڑیوں کا شکار کیا ہے اس کا لب و لہجہ اتنا تند اور آمرانہ ہے کہ اس کے متعلق استاد ذوق کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے ؎

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اس کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

فاضل تبصرہ نگار کی ہمہ دانی بلکہ ان کے عالم غیب ہونے کی ایسی دہشت طاری ہو گئی ہے کہ اب کچھ لکھنے تو درکنار قلم کو ہاتھ لگاتے بھی دل کانپتا ہے۔ میری کتاب کو وہ سراسر بکواس قرار دے دیتے تو کوئی غم نہ تھا۔ میں کیا اور میری کتاب کیا بڑائی صاحب کی کتاب کو وہ مزاحیہ ادب میں کوئی اضافہ نہ سمجھتے تو بھی صبر آجاتا۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ انھوں نے مزاح نویسی کے موضوعات اور طنز و مزاح کے فکر و فن کے متعلق کچھ جدید انکشافات کر کے بلا استثنا "ہر مزاح نگار" اور "ہر طنز نگار" کو ہدف ملامت بنا کر اس کو درس عبرت دینے کی کوشش کی ہے اب اس پر بھی اگر سکوت اختیار کیا جائے اور ان کو چھوٹ دے دی جائے تو یہ نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ خود فاروقی صاحب کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا تبصرے کی ابتدا

یوں ہوتی ہے:۔

"مزاحیہ مضامین کے یہ دو مجموعے ایک ساتھ پڑھے جائیں تو اردو ادب میں مزاح کی رفتار ترقی کی مایوس کن شکل سامنے آتی ہے":

مؤدبانہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں مجموعوں کو ایک ساتھ نہ پڑھیے یکے بعد دیگرے پڑھیے۔ دو کام ایک ساتھ کرنے سے اکثر دماغ مختل ہو جاتا ہے اور ایسی حالت میں کبھی کبھی آسیبی شکلیں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں لیکن خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب آگے چلیے۔ قارئین منتظر ہوں گے کہ ان دو گناہگاروں کی صورت دیکھتے ہی انھیں جو "پھانسی" کا حکم دیا گیا ہے تو ان کے جرائم یقیناً نہایت سنگین اور ناقابل معافی ہوں گے۔ اب فرد جرم ملاحظہ ہو:۔

"وجاہت علی سندیلوی ایک کہنہ مشق اور جانے پہچانے مزاح نگار ہیں۔ براتی صاحب کی عمر ابھی غالباً تیس سال بھی نہ ہوگی۔ یہ امید کی جا سکتی تھی کہ ہر دو حضرات کا رویہ، انداز تحریر، اور مشاہدے میں نمایاں فرق ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے"!

کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ فاروقی صاحب کہنا کیا چاہتے ہیں اور کہہ کیا رہے ہیں زیادہ عمر والا اگر اپنے سے کم عمر والے کی طرح تازگی رکھتا ہے یا کم عمر والا اگر اپنے سے زیادہ عمر والے کی طرح پختگی حاصل کر چکا ہے تو کون سی قیامت آگئی؟ یہ تعریف ہے یا تنقیص؟ لیکن غالباً یہ تنقیص ہی ہوگی کیونکہ فاروقی صاحب نے قسم کھا کر تنقیص ہی کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ شاید ان کا منشا یہ ہے کہ بزرگوں کو سینگ کٹا کر بچھڑوں میں اور نوجوانوں کو داڑھی لگا کر بزرگوں میں اپنی گنتی نہیں کرانی چاہیئے خیال برا نہیں ہے۔ آئندہ جو مصنفین اپنی کتابیں فاروقی صاحب کے پاس پوسٹ مارٹم کی غرض سے بھیجنا چاہتے ہوں انھیں نوٹ کر لینا چاہیئے کہ کتابوں کے ساتھ

اپنی پیدائش اور زندگی کے مختلف واقعات اور حادثات کی تاریخیں لکھنا ہرگز نہ بھولیں خصوصاً تاریخ شادی تو ضرور ہی لکھ دیا کریں تاکہ ان کی کتابوں میں کہیں عورت کا تذکرہ آگیا ہو تو فاروقی صاحب کو یہ لکھنے کا موقع مل سکے کہ دیکھئے فلاں شخص کی شادی کو ابھی بیس ۲۰ سال چھ مہینے ہوئے ہیں اور فلاں شخص کی شادی کو ابھی صرف سترہ ۱۷ سال تین مہینے گزرے ہیں لیکن عورت کی فطرت کے متعلق دونوں کے مشاہدوں میں خلاف توقع بڑی یکسانیت نظر آتی ہے۔

فرد جرم کی اب دوسری دفعہ ملاحظہ ہو:۔

"بڈاری صاحب کے چند عنوانات حسب ذیل ہیں، ہڑتال کا مرض ہمارے مہربان "چپراسی" اشتہار کا مرض، ہم اخبارات پڑھتے ہیں وغیرہ سندیلوی صاحب کے عنوانات ملاحظہ ہوں، ضرورت ایک مکان کی ملازمت کی تلاش، گیہوں کی تلاش، محفل وعظ میں، وغیرہ، دونوں کی یکسانیت اس قدر نمایاں ہے کہ وضاحت کی ضرورت نہیں، مکان کی قلت، مولوی ملاؤں کی حرکتیں، ملازمتوں کی کمی، افسروں کی فرعونیت سیاست دانوں کا ڈھونگ وغیرہ یہ موضوعات کسی نہ کسی طرح سے رشید احمد صدیقی کے وقت سے چلے آرہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مزاح نگاروں کو دنیا میں ان کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔"

موضوعات کی یکسانیت کے سلسلے میں غالباً فاروقی صاحب ہمہ اوست کے قائل ہیں اور انھیں مجنوں نظر آتی ہے اور لیلا نظر آتا ہے۔ ورنہ چپراسی اور محفل وعظ میں کے درمیان کیا قرابت اور ہڑتال کا مرض اور ضرورت ایک مکان کی میں کیا مناسبت اور، ہمارے مہربان اور ملازمت کی تلاش میں کیا مطابقت ہوسکتی ہے؟ فاروقی صاحب نے قارئین کے اوپر نہیں تو اپنے اوپر احسان کیا جو بڑی شان

استغنا سے یہ کہتے ہوئے کہ "یکسانیت اس قدر نمایاں ہے کہ وضاحت کی ضرورت نہیں"۔ بات ٹال دینے کی کوشش کی ہے ورنہ خدارا بتایئے کہ اس مفروضہ یکسانیت کی بقید ہوش وحواس وضاحت ہو بھی کیا سکتی تھی!

ع کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

فاروقی صاحب کی ضد پوری کرنے کی خاطر میں قارئین سے درخواست کروں گا کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ بھی تسلیم کرلیں کہ جی ہاں اشتہار کا مرض اور گیہوں کی تلاش کا موضوع ایک ہی ہے اور اشتہار کے بجائے گیہوں چھاپا اور گیہوں کے بجائے اشتہار کھایا جاتا ہے۔ لیکن اب اس کے بعد فاروقی صاحب کو یہ بتانا پڑے گا کہ جب تک لکھنے والوں پر یہ اعتراض نہ ہو کہ انھوں نے ایک دوسرے کا مضمون چرایا ہے، وہ گردن زدنی کیسے قرار دیئے جاسکتے ہیں؟ کیا ہر لکھنے والے کو کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے بیشتر فاضل تبصرہ نگار سے دریافت کرلینا چاہیئے کہ براہ شفقت بزرگانہ بواپسی ڈاک مطلع فرمایئے کہ اس موضوع میں آپ کن کن موضوعات کی یکسانیت محسوس کرتے ہیں اور ان موضوعات پر آج تک کسی نے کچھ لکھا تو نہیں یا خدانا خواستہ لکھنے کا ارادہ تو نہیں کر رہا ہے۔؟

یکسانیت کا جو نیا بت فاروقی صاحب نے تراشا ہے اس کے روبرو غزل جو اردو زبان کی آبرو کہی جاتی ہے بالکل ہی بے آبرو ہوکر رہ جائے گی۔ ناول اور افسانے کو کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکے گی اور سارے اردو ادب کا بیڑہ ہی غرق ہو جائے گا۔ اور ایک بیچارہ اردو ادب کیا دنیا کی ہر زبان کے ادب کا بیشتر حصہ بے ادبی کے حدود میں داخل ہو جائے گا۔ فاروقی صاحب کی ہدایت پر عمل کیا جانے لگے تو شاید بہت سے چھاپے خانے کیا پیپر مل تک بند ہو جائیں گے۔ جہاں تک اس ارشاد کا تعلق ہے کہ "یہ موضوعات کسی نہ کسی طرح سے رشید

احمد صدیقی کے وقت سے چلے آ رہے ہیں: تو ع

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیئے

رشید احمد صدیقی، ہمارے محترم بزرگ اور مزاح نگاروں کے قافلہ سالار، قبل مسیح یا اب سے دو چار سو سال پہلے کب پیدا ہوئے تھے؟ وہ ہماری خوش قسمتی سے ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمیں ان کے ہم عمر ہونے کا نہ سہی، ہم عصر ہونے کا تو فخر حاصل ہی ہے۔ موضوعات الہام کے طور پر آسمان سے تو نازل ہوتے نہیں بلکہ زندگی کے روزمرہ کے واقعات اور تجربات ہی سے لکھنے والے کے ذہن میں ابھرتے ہیں پھر جن موضوعات سے صدیقی صاحب کو واسطہ پڑا تھا اگر ان کے ہمعصر دوسرے لکھنے والوں کو بھی وہ در پیش ہو گئے تو اس میں کراہیت اور ناراضگی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟۔

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ جن موضوعات سے فاروقی صاحب کو کفن اور کافور کی بو آتی ہے کیا واقعی وہ ہمارے درمیان سے مفقود ہو چکے ہیں۔ مکان کی قلت کا کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا؟ مذہب کے خود ساختہ ٹھیکیداروں نے اپنے ہتھکنڈوں سے توبہ کر لی؟ ہر شخص ملازم اور بارونہ گار ہو چکا ہے؟ افسران اپنی فرعونیت سے تائب ہو کر رشتہ اخلقی بن چکے ہیں؟ اور ریاست دانوں نے اپنی پرانی شعبدہ بازی کو چھوڑ کر جدید شاعری شروع کر دی ہے؟ کیا یہ مسائل پہلے سے کہیں زیادہ سنگین اور ناقابل برداشت نہیں ہو چکے ہیں؟ مجھے تو اپنی ان باتوں سے وہ تبصرہ نگار سے زیادہ کسی صوبے کے مکھ منتری معلوم ہوتے ہیں جسے چاہے آگ لگے اور چاہے پانی برسے اپنے عہد حکومت میں ہر طرف سب "کشل منگل" ہی دکھائی دیتا ہے۔

آفتاب کو چراغ دکھانا نہ سمجھا جائے تو دبی زبان سے یہ بھی عرض کرتا چلوں

کہ موضوعات کبھی پرانے نہیں ہوتے البتہ انھیں دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کے زاویئے اور انداز بدل جایا کرتے ہیں، دنیا کا سب سے پرانا موضوع روٹی ہے لیکن آج بھی دنیا کا سب سے اہم ترین موضوع یہی ہے اور غالباً خود فاروقی صاحب نے اس کے موضوع کی بوسیدگی کے باوجود ابھی تک اس کا استعمال چھوڑا نہ ہوگا۔ البتہ یہ بات دوسری ہے کہ وہ اس کے حصول کی کوشش سے بے نیاز ہوں اور ایک بیچارے لکھنے والے کو اس کے لئے ملازمت کی تلاش، اور گیہوں کی تلاش، کرنا پڑتی ہو اور اس سلسلے میں افسران کی فرعونیت اور ریاست والوں کے ڈھونگ سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہو۔

اور پھر ان سراسر ہوائی باتوں کے بعد فاروقی صاحب کا ٹیپ کا بند ملاحظہ ہو جو یقیناً داد سے مستغنی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مزاح نگاروں کو دنیا میں ان کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔"

مطلب یہ کہ ہمارے مزاح نگاروں کو موضوعات مندرجہ بالا مثلاً مکان کی قلت، ملازمتوں کی کمی، مولویوں اور ملاؤں کی حرکتیں افسروں کی فرعونیت اور ریاست والوں کا ڈھونگ جو اُن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنے ہوئے ہیں کیوں نظر آتے ہیں ان کے بجائے ان کو کچھ اور نظر آنا چاہیئے مثلاً کالے دیو کے پنجے، نیلم پری کے پر، ہلاکو خاں کا گھوڑا، نیتا غورث کی داڑھی۔ ہیر لیتمرپا کی ناک، بزاخفش کے سینگ وغیرہ۔

مزاح نگاروں کی اس بصارت کی کمزوری کا سبب بڑا عبرت انگیز ہے فاروقی صاحب کی زبان سے سنیئے اور داد دیجئے!

"دراصل یہ کمزوری اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ہمارا ہر مزاح

نگار خود کو طنز نگار بھی ثابت کرنا چاہتا ہے اور ہر طنز نگار چاہتا ہے
کہ لوگ اُسے ظریف بھی مانیں۔ اس زبردستی کی ملاوٹ نے مزاحیہ
ادب کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ واہی۔ تخلص بھوپالی۔ احمد جمال پاشا
سب اسی روگ کے مارے ہوئے ہیں۔ دنیا میں خالص مزاحیہ چیزیں
ہزاروں ہیں اور اگر ان کے بارے میں لکھتے وقت اتفاقیہ کچھ طنز
آ جائے (جیسے شوکت تھانوی) تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن زبردستی خود کو
ہر وقت سنجیدہ بنائے رکھنا اور ہر چیز کو تنقید کی عینک سے دیکھنا مزاح
نگار کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔"

فاروقی صاحب کی رائے میں جس طرح ماہر امراض چشم اور ماہر امراض دندان علیحدہ
علیحدہ سائن بورڈ لگاتے ہیں اسی طرح ادب میں خالص مزاح نگار اور خالص
طنز نگار ہونا چاہئیں۔ وہ کسی چیز کو بالکل سفید یا بالکل سیاہ تو دیکھ سکتے ہیں لیکن
چتکبری چیز سے انھیں سخت نفرت ہے۔ ذات پات اور چھوت چھات کی ذہنی بیماریاں
غالباً اسی قسم کی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔

طنز و مزاح کی ملاوٹ کے متعلق فاروقی صاحب کے اعتراض کا جواب خوش
قسمتی سے خود ان کے اعتراض میں موجود ہے۔ جب ان کے قول کے مطابق بلا
استثنا ہر مزاح نگار طنز نگار اور بلا استثنا ہر طنز نگار، مزاح نگار بننا چاہتا
ہے، تو جب تک ہم یہ باور نہ کر لیں کہ وہ سب کے سب کسی بہت سنگین متعدی مرض
میں مبتلا ہیں، اس صورت حال کا سیدھا سادھا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مزاح اور طنز شیر
و شکر کی طرح ایسے گھلے ملے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا
خالص مزاح اور خالص طنز آپ کو خالص گھی کی طرح بہت مشکل ہی سے نظر آئیں
گے۔ مزاح اگر صرف برائے مزاح اور طنز اگر صرف برائے طنز نہیں ہے تو دونوں

میں ایک دوسرے کی ملاوٹ ناگزیر سی ہے اعلیٰ ترین مزاح وہ ہے کہ جس میں طنز اور اعلیٰ ترین طنز وہ ہے کہ جس میں مزاح کی بھی چاشنی ہو۔ رہا سوال یہ کہ مزاح میں طنز اور طنز میں مزاح کی کتنی اور کیسی آمیزش ہونی چاہیئے تو اس سے کوئی صاحب ذوق انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے لئے حسن تناسب کا لحاظ اور افراط و تفریط سے پرہیز لازمی ہے۔ ورنہ دال میں نمک کے بجائے نمک میں دال کا مضمون سامنے آجائے گا یہ ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے اور اس کو بیان کرنے کے لئے بحر العلوم بن کر کسی قسم کا رعب ڈالنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

چلتے چلاتے بلکہ اپنے نرغے میں گھرے ہوئے دو زیر تبصرہ مزاح نگاروں کی خبر لیتے لیتے فاروقی صاحب نے واہی صاحب، تخلص بھوپالی صاحب اور احمد جمال پاشا صاحب کی پگڑیاں جس چابکدستی سے اچھال دی ہیں اس سے اپنے قصبے کے ایک ماہر پھیت کی یاد تازہ ہوگئی۔ مرحوم اپنے حریفوں پر وار کرتے کرتے اکثر پاس کھڑے تماشائیوں کے بھی دو چار ہاتھ رسید کر دیتے۔

بڑا ظلم ہوگا اگر اب اور آگے بڑھنے سے پہلے اس موقع پر فاروقی صاحب کے خیالات کی بے ربطی اور دلائل کی بے ثباتی کی داد نہ دی جائے۔ مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے مایوس کن ہیں! کیوں؟ اس لئے کہ ان کے موضوعات یکساں اور ان باتوں سے متعلق ہیں جو رشید احمد صدیقی صاحب کے عہد میں ظہور پذیر ہوا کرتی تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ مزاح نگاروں کو ان موضوعات کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ چلئے یہ بھی مان لیا۔ لیکن یہ بصارت کی کمزوری کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ لوگ مزاح میں طنز کی ملاوٹ کر دیتے ہیں۔

مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ! موضوعات کے متعلق نظر کی کمزوری اور مزاح میں طنز کی ملاوٹ میں کیا رشتہ اور تعلق ہو سکتا ہے۔ کیا اس کی کوئی ضمانت ہے

کہ اگر ہمارے مزاح نگار اپنے موضوعات بدل دیں تو وہ مزاح میں طنز کی ملاوٹ نہیں کریں گے؟ بلائنگ سے بالائی بنانے والا کیا جب دودھ بیچے گا تو اس میں پانی نہیں ملائیگا؟ کیا تبصرہ نگاری ویس اور منطق کی تمام قیود سے آزاد ہے ؂

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کتنی زبردستی ہے کہ دودھ، گھی اور آٹے وغیرہ میں ملاوٹ کرنے والے تو ہٹے کٹے، چاق چوبند گھوم رہے ہیں لیکن فاروقی صاحب کے حکم سے مزاح میں طنز کی ملاوٹ کرنے والوں کی بینائی فوراً گم کردی جاتی ہے۔

اوپر فاروقی صاحب کی جو عبارت حرف بحرف نقل کی جاچکی ہے اسی کے تسلسل میں فاروقی صاحب فرماتے ہیں:۔

"وزیر آغا کو یہ فن نبھانا خوب آتا ہے ان کے پہلے پطرس اور عظیم بیگ چغتائی اور فرحت اللہ بیگ (ایک چھوٹا سا مزاح نگار) سید ابو تمیم فریدآبادی سے یہ توقع کر سکتے تھے کہ ان کتابوں کے انتساب یوں ہوں گے:۔

"اس کرسیٔ اقتدار کے نام جسے پاکر انسان اپنی انسانیت بھول جاتا ہے" (محبوب بڑائی) "ان باہمت ساتھیوں کے نام جو زندگی کی جاں گسل کشمکش کے درمیان بھی خود زندگی پر ہنسنے اور اس کا مذاق اڑانے سے نہیں چوکتے"۔ الخ۔ (وجاہت علی سندیلوی)

احمد شاہ بخاری زندہ ہوتے تو کہتے حضرت جبہ و دستار و تسبیح کے بغیر بھی لقمہ توڑا جاسکتا ہے۔"

وزیر آغا صاحب کو کون فن نبھانا خوب آتا ہے، اس کی کوئی تشریح نہیں کی

گئی۔ فرحت اللہ بیگ کو محض تفریحاً ایک چھوٹا سا مزاح نگار لکھ دیا۔ پطرس، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ اور سید ابو تمیم فرید آبادی جیسے معتبر اور مستند مزاح نگاروں سے تو یہ توقع ہو سکتی تھی کہ ان کے انتساب یوں ہوں گے لیکن اگر زیر تبصرہ مزاح نگاروں نے انھیں یوں لکھدیا تو ان پر لاٹھی چارج ہونے لگا؟ اس کی وضاحت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی البتہ احمد شاہ بخاری اگر زندہ ہوتے تو کیا کہتے اس کی عالم غیب بن کر بشارت دیدی گئی ہے۔ تبصرہ نگار نہ ہوا ایک مجذوب ہوا کہ واہی تباہی جو جی میں آیا بک دیا۔ میرا خیال ہے کہ احمد شاہ بخاری اگر زندہ ہوتے تو اس موقع پر غالباً کچھ اور نہیں صرف یہ کہتے۔ ع

شکوہ بے جا بھی کرے کوئی، تو لازم ہے شعور!

فاروقی صاحب کو شاید اعتراض یہ ہے کہ زیر بحث کتابوں کے انتساب ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ کیوں ہیں۔ اور اسی سیدھی سی بات کو گھما پھرا کر انھوں نے ایک عجوبہ یا کنگارو کا بچہ بنا کر پیش کیا ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ انتساب مصنف کی بالکل ذاتی اور نجی چیز ہوا کرتی ہے اور اس کے متعلق کوئی گرفت کرنا ادبی اخلاق کے منافی ہے۔ اس کے علاوہ ان انتسابوں میں کوئی ایسی کھٹکنے والی یا، قابل اعتراض بات بھی سمجھ میں نہیں آتی جس پر فاضل تبصرہ نگار کا اتنا زیادہ چراغ پا ہو جانا جائز قرار دیا جا سکے۔ اس سے تو صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے موضوع سے کسی ہمدردی یا دلچسپی کے بجائے شدید قسم کا بغض و کینہ رکھتا ہے اور احساس کمتری کے باعث اس نے اس پر صرف ایذا رسانی، اور دبے ہوئے غم و غصے کے اظہار اور اپنی ہمہ دانی کا ڈھول پیٹنے کے لئے قلم اٹھایا ہے۔

اسے محض ایک زبردستی کی ضد ہی کہا جا سکتا ہے کہ کسی مزاحیہ کتاب کا انتساب بھی مزاحیہ ہو۔ ایک مزاح نگار اور ایک مسخرے میں جو فرق ہوتا ہے اسے فاضل

تبصرہ نگار غالباً نہیں سمجھتا ورنہ کم سے کم ایسے سخرے پن سے تو وہ باز ہی رہتا۔
تعجب ہے کہ فاروقی صاحب نے یہ کیوں نہیں کہا کہ کسی کو مزاح نگاری کا حق اس وقت تک حاصل نہیں جب تک وہ بھانڈوں کی سی وضع قطع نہ بنائے اور بیر بخارا میں رہتا نہ ہو۔

ابھی چند سطروں پہلے مزاح نگاروں کی مزاج پرسی اس بات پر کی جا رہی تھی کہ وہ مزاح میں طنز کی زبردستی ملاوٹ کر دیتے ہیں۔ اب اس بات کا ماتم سنیئے کہ وہ طنز لکھنے کی کوئی صلاحیت ہی نہیں رکھتے بالکل وہی بات ہے جیسے پہلے کسی پر یہ الزام لگایا جاتا کہ وہ کسی حسینہ کو بری نگاہ سے دیکھ رہا تھا اور پھر دوسری ہی سانس میں الزام لگانے والا یہ چیخنے لگے کہ دیکھنے والا پیدائشی اندھا ہے۔

ملاحظہ ہو :-

"طنز نگاری کے لئے جس شدید غم و غصے، احساس برتری اور بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جھلسا دینے والے مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سندیلوی صاحب اور محبوب بڑائی صاحب کو ودیعت ہی نہیں ہوا ہے۔"

طنز نگاری کے لئے فاروقی صاحب جو لوازمات ضروری سمجھتے ہیں وہ خود ان میں طنز نگار نہ ہوتے ہوئے بھی، بحیثیت تبصرہ نگار بدرجۂ اُتم پائے جاتے ہیں۔ غالباً یہی لوازمات بے تحاشہ، ادھا دھند، لٹھ بازی کے لئے بھی ضروری ہوا کرتے ہیں۔ کوئی پُرامن بھلا آدمی اگر ان سے محروم ہے تو فاروقی صاحب اسے اس کی کمزوری سمجھتے ہیں اور نادانستہ طور سے انھوں نے بڑائی صاحب اور مجھ کو بڑا اچھا کیریکٹر سرٹیفکٹ دیا ہے۔

اس کے بعد یوں گل افشانی فرماتے ہیں:-

"انگریز ادیب پوپ کے بارے میں ہیملٹن ڈوبوسے کا جملہ ملاحظہ ہو، خارجی دنیا کے تجربات پوپ پر احساسات کی طرح اثر انداز ہوتے تھے۔

ایک جلتا ہوا شدید غصہ اور بہ قبیلِ جذبۂ تحقیر و استہزا دو شعلہ جوالہ
سے بھی زیادہ جھلسانے اور تپانے والا تھا۔"

نہیں معلوم فاروقی صاحب کو اس موقع پر بلا واسطہ اور ضرورت اس حوالے
کو پیش کرنے کی کیا حاجت در پیش آ گئی۔ غالباً یہ جتانا مقصود ہے کہ وہ پوسیادر
یا ئی، دو بڑے کے نام بھی جانتے ہیں۔ فیر صاحب جانتے ہوں گے۔ اب مزید
خلط مبحث ملاحظہ ہو:۔

"یہ مزاج اکبر کو نصیب ہوا تھا۔ لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں
کی۔ رشید احمد صدیقی کو تھا اور جہاں جہاں وہ جملہ بازی سے بچ نکلے
ہیں وہاں وہاں ان کا طنز دل کو ہلا دیتا ہے۔ سودا میں بھی یہ صفات
تھی، بہ قول آل احمد سرور، سودا آلام روزگار پر روتے ہیں، قہقہہ
لگاتے ہیں۔ ان کے قہقہے میں زہر خند ہوتا ہے"

مطلب یہ کہ فاروقی صاحب نے اکبر کو تو بالکل فیل کر دیا۔ رشید احمد صدیقی
صاحب کو پروموشن دیدیا اور آل احمد سرور صاحب کی سفارش پر سودا کو پاس
کر دیا۔ اب کس کے منہ میں دانت ہیں جو یہ ان سے پوچھے کہ اس اظہار ہمہ دانی
کا یہ کون سا موقع و محل تھا۔ طنز نگاری کے متعلق آپ سے کون بحث کر رہا
ہے اور اس کی تاریخ بیان کرنے کی اور مختلف طنز نگاروں کے درجے اور منصب
مقرر کرنے کی آپ سے کس احمق نے فرمائش کی تھی ؎

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اب اشک شوئی اور پیشین گوئی ملاحظہ ہو:۔

"وجاہت علی سندیلوی بہت حد تک اور محبوب برائی ایک حد

تک کامیاب مزاح نگار ثابت ہو سکتے ہیں اگر وہ طنز کا قلادہ اپنے
گلے سے اتار پھینکیں۔ سندیلوی صاحب بہت اچھی نثر لکھتے ہیں انھیں
مکالمے اور محاورے کا خاص سلیقہ ہے ان کی زبان کا اپنا آہنگ
ہے جو ان کے موضوع کے لیے انتہائی مناسب ہے۔ معمولی بات میں
ہنسی کا پہلو نکال لینا جو مزاح نگار کا خاصہ ہے سندیلوی صاحب کے
یہاں بیش از بیش اور برائی صاحب کے یہاں کم کم نظر آتا ہے لیکن
پھر بھی محبوب برائی اس لیے قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے گھریلو
موضوعات پر بھی نظر رکھی ہے اور جدید تہذیب کی نمائندہ خامیاں
بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان کی صلاحیتیں ابھی انھیں اور
بھی آگے لیجانے کا امکان رکھتی ہیں۔"

فاروقی صاحب کی اس قدر افزائی پر مرزا غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

لیجیے تبصرہ ختم ہو گیا۔ قارئین کے دلوں میں تبصرہ نگار کی ہیبت اور جلالت
کا سکہ بھی بیٹھ گیا اور انھوں نے زیر تبصرہ کتابوں کے مصنفین کی قسمتوں کا فیصلہ
بھی سن لیا۔ انھیں یہ بھی پتا چل گیا کہ مزاح کے موضوعات کا انتخاب صحیح نہیں
کیا جاتا اور اس کی وجہ یہ ہے مزاح میں طنز کی آمیزش زبردستی کر دی جاتی
ہے اور ان کی معلومات میں یہ بھی اضافہ ہو گیا کہ طنز نگاری کے لیے شدید غم و
غصے اور بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جھلسا دینے والے مزاج کی ضرورت ہوتی
ہے وغیرہ وغیرہ اور یہ سب باتیں فاروقی صاحب کو "منہ زبانی" یاد ہیں لیکن ان بیچاروں
کے پلّے وہی نہیں پڑا جو تبصرے کا اولین مقصد ہونا چاہیے تھا یعنی یہ کہ زیر بحث کتابوں

میں ہے کیا؟ وہ کس مرض کی دوا ہیں؟ ان میں زندگی کی ترجمانی کس انداز سے کی
گئی ہے؟ ان کی متداول ادب میں کیا حیثیت ہے؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ
وہ پڑھنے کے لائق ہیں بھی یا نہیں؟ نقارہ تو بڑے زور سے بجا لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا
کہ آخر کیوں؟ شاید صرف نقارہ بجانے والے کے دست و بازو کی قوت کا لوہا منوانے
کے لئے! قصور معاف! اس کو تبصرہ نہیں کہتے یہ محض خود آرائی اور لن ترانی ہے۔

کیا تبصرے کی تعریف یہی ہے کہ وہ ایک تیز اور پرشور راکٹ کی طرح سروں
پر سے دندناتا نکل جائے اور دیکھنے والوں کے ہاتھ سوائے دہشت اور استعجاب
کے کچھ بھی نہ آئے۔ وہ کسی کتاب کے متعلق قارئین کے سوچنے، سمجھنے اور پرکھنے کی
صلاحیتوں کی تربیت اور رہبری کرنے کے بجائے ان کو اپنے بے بنیاد بلند آہنگ
دعووں سے مفلوج کر کے ازکار رفتہ بنا دے۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

فاروقی صاحب کے پورے تبصرے کو بلا کسی تحریف کے من و عن اوپر پیش
کیا جا چکا ہے۔ اونٹ کی طرح اس کی کوئی بھی کل سیدھی نظر نہیں آتی۔ ملال اس بات
کا ہرگز نہیں ہے کہ تبصرہ نگار معترض کیوں بنا۔ سچ پوچھئے تو عموماً اخباروں اور
رسائل میں مختلف تصانیف پر جو چلتا ہوا اور سرسری تبصرے کئے جاتے ہیں اور جن
میں سارے تعریف و توصیف کے بعض بندھے ٹکے جملے دہرائے جاتے ہیں اور جن سے
کبھی تو دوست نوازی اور مصلحت اندیشی ظاہر ہوتی ہے اور کبھی "من ترا حاجی
بگویم تو مرا حاجی بگو" کی بو آتی ہے اور کبھی خود تبصرہ نگار کی کم مائیگی کی قلعی کھل جاتی
ہے ان سے دل اس قدر بھر گیا ہے کہ اس پامال روش سے ہٹ کر کوئی بھی تبصرہ
نیک نیتی اور تنقیدی نظر سے کیا جاتا، اور اگر اس سے اختلاف بھی ہوتا یا اچھا کر دیتا

کی پول بھی کھلتی تو برا نہیں معلوم ہوتا۔ ملال اس بات کا ہے کہ فاروقی صاحب نے زیر بحث کتابوں کو اپنے تبصرے میں چھوا تک نہیں البتہ موضوعات کی یکسانیت مزاح میں طنز کی ملاوٹ اور بغیر طنز کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جھلسانے والے مزاج کی ضرورت وغیرہ جیسی ہوائی باتیں چھیڑ کر انھوں نے گویا ڈنڈا تلاش کیا ہے تاکہ اس پر وہ اپنی قابلیت کا پرچم بلند کر سکیں اور جس سے وہ ضمناً اپنے جنگل میں پھنسے ہوئے مزاح نگاروں کی کچھ مرمت بھی کر ڈالیں کیونکہ بغیر اس کے قارئین پر خاطر خواہ رعب نہیں پڑ سکتا تھا۔ لیکن دوسروں کی پگڑیاں اچھالنے کی کوشش میں جب خود اپنی پگڑی یا تلعی کھل جاتی ہے تو علامہ بقراط بننے والا صرف حاجی بغلول نظر آنے لگتا ہے۔

فاروقی صاحب نے سب سے بڑا ستم یہ کیا ہے کہ وہ زیر بحث مصنفین سے زیادہ قارئین کو اپنا مال غنیمت اور حلقہ بگوش سمجھ بیٹھے ہیں چنانچہ وہ ان کے نام صرف اپنے فرمان جاری کرتے ہیں اور اپنے کسی فیصلے یا حکم کے متعلق ان پر کوئی وجہ یا سبب ظاہر کرنا اپنے منصب اور مرتبے کے منافی سمجھتے ہیں۔

زیر بحث تبصرے پر ایک پرانا واقعہ یاد آگیا۔ بہت دن ہوئے مقامی اسکول کے ایک ڈرامے میں ایک صاحبزادے نے تھانیدار کا پارٹ کیا تھا۔ وہ تھانیدار کی وردی پہن، مونچھیں لگا، اور ہاتھ میں بید لے کر اکڑتا ہوا اسٹیج پر آیا تو مارے اکڑفوں کے اپنا پارٹ وغیرہ تو بھول گیا البتہ اپنے آپ کو واقعی ایک مادرزاد تھانیدار سمجھتے ہوئے اسٹیج سے پھاند کر تماشائیوں میں جا گھسا اور دو چار کو کئی بید رسید کر دیئے۔ واہ واہ کے بجائے بڑی لے دے ہوئی لیکن اس روز سے ان برخوردار کو ہر کوئی تھانیدار پکارنے لگا۔ فاروقی صاحب نے بھی تبصرہ تو خیر کیا البتہ تبصرے نگاری کی کرم دھم خوب دکھائی ہے ان کی تبصرہ نگاری اگر اسی انداز سے کچھ دن اور جاری رہی تو اس سے قارئین کو یہ فائدہ ضرور پہنچے گا کہ وہ انھیں واقعی تبصرہ نگار سمجھنے لگیں گے۔

سندباد کی واپسی

سندباد جہازی ایک مدت دراز کے بعد اپنے آخری تاریخی سفر سے واپس آیا تو اس کے سر پر ٹوپی تھی نہ پاؤں میں جوتا۔ چہرے پر بے تحاشہ بڑھی ہوئی داڑھی، تن پر بوسیدہ بش شرٹ اور ڈیڑھ پانچوں کا پتلون اور ہاتھ میں ایک ایسا جھولا جیسے کوئی ہم سفر ٹرین میں بھول گیا تھا اور اس نے مال غنیمت سمجھ کر ٹانگ لیا تھا۔ بس صرف یہی اس کا لباس اور اسباب تھا۔ جب وہ اپنی عادت کے بموجب پلیٹ فارم کے دوسری طرف پٹریوں پر اترا تو اس کی نظر سب سے پہلے اپنے پرانے دوست شیخ چلی پر پڑی جو ایک بھینس کے سامنے کھڑا بین بجا رہا تھا۔

یہ منظر دلفریب دیکھ کر سندباد نے ایک نعرۂ مستانہ لگایا اور حرف مطلب یوں زبان پر لایا۔

"اے اپنے باپ کے بیٹے میاں شیخ چلی! اپنے شغل بیہودہ کو بے کار شائع کرتے ہو اور ایک بے زبان جانور کا وقت مفت میں ضائع کرتے ہو!" شیخ چلی نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی تاکید کی لیکن سندباد نے اس اشارے کو سمجھا یا اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی بلکہ ایک کم چوپایہ بنتے ہوئے بھینس کے تھنوں سے اپنا منہ لگا دیا۔ اور چونکہ اپنی شہرۂ آفاق سیاحتوں کے باعث وہ جانوروں کے عادات و خصائل سے بخوبی واقف تھا لہٰذا کسی بھوکے اور مشتاق بچھڑے کی طرح اچک اچک کر دودھ پینے لگا۔ شیخ چلی جو اس لطفے

میں غلطاں تھا کہ عقل بڑی یا بھینس ؟ کافی دیر تک سمجھ نہیں پایا کہ کیا ہو رہا ہے۔
بالآخر جب وہ اپنے خوابِ خرگوش سے چونکا اور اس نے دیکھا کہ اس کے دوست
کے منہ میں دودھ کے فوارے امنڈ رہے ہیں۔ تو اس کے پیٹ میں چوہے کودنے
لگے چنانچہ اس نے بین بجانا بند کر دیا اور اپنی بین کو بھینس کے منہ میں دیتے ہوئے
کہ جس نے اس کو فوراً ہی چبانا شروع کر دیا، اس کے بقیہ تھنوں کی تلاش میں
سند باد کی داڑھی ہٹانے لگا۔ غالباً یہ بات بھینس کو ناگوار معلوم ہوئی اور اس
نے ایک ایسی شاطرانہ دولتی چلائی کہ سند باد اور شیخ چلی دونوں بیک وقت زمین
بوس اور بغلگیر ہو گئے۔ اور وہ کلیلیں بھرتی ہوئی سامنے تالاب میں کود پڑی۔
دونوں دوست کافی دیر تک بے سدھ پڑے رہے۔ رَین چلی گئی۔ ایک
درخت کے سب کوّے اڑ گئے۔ دوسرے درخت پر کچھ نئے کوّے آ کر چیخنے لگے
شیخ چلی نے آہستہ آہستہ پہلے اپنی ایک آنکھ کھولی اور بھینس کو تالاب میں تیرتا
دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔

"اب میں سمجھا کہ دودھ میں پانی کیسے ملایا جاتا ہے"

"سند باد نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔" کیا مطلب" ؟

شیخ چلی نے اپنی دوسری آنکھ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

" وہ دیکھو یہ بھینس آنکھوں میں کیسی دھول جھونک رہی ہے ؟ اور تالاب
میں گھسی ہوئی اپنے دودھ میں پانی ملا رہی ہے۔" سند باد نے اس جواب لاجواب
پر ایک بے ساختہ قہقہہ لگایا جو شیخ چلی کو ایک آنکھ نہ بھایا بلکہ غیر ضروری اور بے
موقع معلوم ہوا لہٰذا منہ بسور کر برس پڑا۔

"اے سیاح ناعاقبت اندیش ! میں ایک گوشۂ تنہائی میں ایک راس بھینس
کے کانوں کو اپنی نغمہ ریزی سے متاثر کر رہا تھا۔ تجھے ایسے موقع پر آنا اور مداخلت

کرنا کیا ضرور تھا؟"

سندباد نے جواب دیا "اپنے آنے کا ذمہ دار میں نہیں میری ٹرین ہے۔ رہا مداخلت کا سوال تو میں نے ہرگز کوئی مداخلت نہیں کی اور سچ پوچھو تو مداخلت بلکہ دخل در معقولات کے مرتکب تو تم خود ہوئے ہو۔ تم بھینس کے کانوں کو متاثر کر رہے تھے۔ اور میں اس کے تھنوں سے کہ پوری بھینس میں صرف وہی کام کی چیز ہیں خود متاثر ہونا چاہتا تھا۔ تم اگر اپنے کام پر قانع رہتے اور اپنی حرص و ہوا کے ماتحت بھینس کے تھنوں کی تلاش میں میری داڑھی کو نہ چھیڑتے تو یقیناً ہم دونوں کے درمیان کوئی غلط فہمی ہرگز نہ پیدا ہوتی۔"

شیخ چلی نے کچھ بدحواس ہو کر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "اے سیاح شیر خوار! بھینس کی مشترکہ دولتی سے ہمارا رشتۂ اخوت اور بھی مضبوط ہو گیا ہے۔ اور ہم ایک ہی دولت مشترکہ کے ممبر ہو گئے ہیں۔ تمہیں وطن واپس آنا مبارک ہو! میں مقامی گزٹ کے آنریری ایڈیٹر کی حیثیت سے تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

سندباد اس باضابطہ خیر مقدم سے بہت خوش ہوا اور تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد دونوں دوست پہلے کچھ ہنسے پھر روئے اور پھر بڑی گرمجوشی سے دو بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی طرح دوبارہ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ شیخ چلی نے پوچھا۔۔

"اے دوست تم پہلے ہنسے اور پھر روئے کیوں؟"

سندباد نے جواب دیا "مقامی گزٹ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پہلے اس سوال کا جواب خود تمہیں دینا چاہیئے۔"

شیخ چلی نے کہا "پہلے آپ"

سندباد نے کہا "جی نہیں پہلے آپ"!

شیخ چلی نے اداکارانہ انداز میں ہاتھ جوڑتے اور قریب قریب روتے ہوئے
پھر اصرار کیا۔ "اے حضور! میں آپ کے قربان! بھلا آپ کی موجودگی میں کوئی
پیش قدمی میں کرسکتا ہوں؟ ۔ پہلے آپ"

سندباد نے حلق صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہنسا یوں کہ اکثر رسالوں
میں میں نے یہ اشتہار پڑھا ہے کہ ہنسو اور موٹے ہو جاؤ! اور رویا اس لئے کہ میں نے
ایک مرثیہ خواں کی زبانی سن رکھا ہے کہ رونے سے عقل بڑھتی ہے۔"

شیخ چلی نے منہ بسور کر جواب دیا "یار تمہیں نے بھینس کا دودھ پیا اور تمہیں
ہنس کر موٹے اور رو کر عقل والے بنے اور میں دنیا کا [illegible] بقول تمہارے مقامی
گزٹ کا آنریری ایڈیٹر ہی رہا۔ میں ہنسا اس لئے کہ میں نے سوچا کہ اگر مجھے اب
وہ گمشدہ بھینس مل جائے تو میں بھی تمہاری طرح اس کا دودھ [illegible] اور
رویا اس خیال سے کہ بس رونے کو جی چاہا۔ مطلب یہ کہ جسم کے جس حصے پر بھینس کی لات
پڑی ہے وہ ابھی تک درد کر رہا ہے۔"

دونوں دوست اس انہماک سے گفتگو کر رہے تھے کہ انہیں اسٹیشن ماسٹر
کی آمد کی بھی خبر نہیں ہوئی اور اس کی اچانک تحکمانہ کھنکار سے شیخ چلی گھبرا گیا
اور گھبرا کر "پہلے آپ" چیخ کر سندباد سے لپٹ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے ڈپٹ کر پوچھا۔
"تم مشتبہ لوگ یہاں ریل کی پٹری پر کیا کر رہے ہو؟"

شیخ چلی نے جواب دیا۔ "ہم مشتبہ لوگ نہیں ہیں۔ فدوی مقامی گزٹ کا
ایڈیٹر ہے اور میرا یہ دوست سندباد جہازی صرف آدھا بے ٹکٹ ہے کیونکہ [illegible]
اس کا آدھا ٹکٹ پڑنا چاہیئے۔"

اسٹیشن ماسٹر نے سندباد سے ٹکٹ مانگا۔ سندباد نے بغلیں جھانکتے ہوئے جواب
دیا۔ "میں جہاں سے سفر کر رہا ہوں وہاں نہ ریل تھی نہ ٹکٹ۔" اس بے ڈھنگ

جواب سے اسٹیشن ماسٹر متعجب ہوتے ہوتے رہ گیا اور سندباد کو ڈانٹنے لگا۔ سندباد اس ڈانٹ سے بالکل نہ گھبرایا بلکہ بڑے اطمینان سے اپنے جھولے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک کنگھا نکال کر اسٹیشن ماسٹر کو بطور نذرانہ پیش کرتے ہوئے بولا "میرا جہازی ہوں ریل پر سفر کرنے کا یہ پہلا اتفاق ہے۔ بہر حال میرے مال غنیمت میں جو آپ کا حصہ ہے اسے پیش کرنے میں کوئی گریز نہیں کر رہا ہوں۔" اسٹیشن ماسٹر نے دانت پیستے ہوئے کنگھا لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور شیخ چلی کی طرف مڑ گیا۔

"آپ کس ایڈیٹر کے مقامی گرٹ ہیں؟" شیخ چلی اس سوال کے لئے پہلے ہی سے تیار ہو چکا تھا لہٰذا اس نے اپنی مٹھی میں دابی ہوئی چونی مٹھی کھول کر آگے بڑھا دی جس کو اسٹیشن ماسٹر نے ازراہِ غربا پروری فوراً قبول کر لی اور پھر بڑی گرجدار آواز میں یہ کہتے ہوئے مڑ گیا اور دھاکتا چلا گیا۔

"تم دونوں ایک دم میری نظروں سے اوجھل ہو جاؤ ورنہ پاگل کر کے مجھوا دوں گا۔" سندباد اور شیخ چلی نے اپنے قہقہوں کے درمیان اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

شیخ چلی کچھ دیر خاموشی کے بعد بولا "اے دوست دل پسند! مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ جب آخری دفعہ تم اپنے سفر پر جانے لگے تھے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر میرے لئے کانٹا بانکا کے جزیرہ سے ایک نایاب الّو لاؤ گے۔" سندباد نے اپنے جھولے میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا سا آئینہ نکال کر شیخ چلی کو دیتے ہوئے بولا "لو اس پنجرے میں تمہارا الّو بند ہے۔ جب چاہنا اسے دیکھ لینا۔" شیخ چلی اس موٹی بات کو سمجھ نہیں پایا اور آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر بندر کی طرح منہ بنا بنا کر ہنسنے لگا۔

دونوں دوست چلتے ہوئے اب اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل چکے تھے

اور شہر کی طرف جا رہے تھے۔ شیخ چلی جس کے دماغ سے نئے نئے موضوعات کی پھلجھڑیاں برابر چھوٹتی رہتی ہیں ایک دم چیخ اٹھا۔ "میاں سندباد تم اتنے بڑے سفر سے واپس آ رہے ہو لہٰذا تم میرے اخبار کے ذریعہ اہالیان وطن کو ایک گرما گرم پیغام کیوں نہ دے ڈالو؟"

سندباد نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "تمہارا اخبار کب نکلا تھا کب سے نہیں نکلا۔ اس کے کتنے خریدار ہیں اور اس کی پالیسی کیا ہے؟ کسی بھی دو سوالوں کا جواب مختصر بیان کرو۔"

شیخ چلی نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا "تین برس ہوئے جب اخبار نکلا تھا تین برس ہوئے جب سے اخبار نہیں نکلا۔ شہر کے تمام عطار اور پنساری اس کے خریدار ہیں اور اسے جلد سے جلد نکالنے کے لئے مجھ سے تقاضے کرتے رہتے ہیں۔ اخبار کی پالیسی یوں تو بہت لمبی چوڑی ہے لیکن اس کا ماحصل بس یوں سمجھ لیجئے کہ خواب غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور بے روزگار ایڈیٹر کو باروزگار بنانا۔ کسی بھی دو جوابوں پر نمبر دیدیجئے۔"

سندباد نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ذرا کڑی مسکراہٹ سے کہا "میرا ارادہ تو اپنے پیغامات کی علیحدہ ایک کتاب شائع کرانے کا ہے لیکن تمہارا اصرار ہے تو یہ مختصر پیغام شائع کر دینا، آئندہ چوبیس گھنٹے میں موسم خشک اور تر رہے گا۔ لہٰذا خشکی سے بچنا اور تری سے ڈرنا چاہیئے۔ عوام کی خدمت اپنا مقصد زندگی بناؤ لیکن مت بھولو کہ عوام کی پہلی اور آخری نشانی تم اور صرف تم ہو [illegible]" سندباد کے سر میں کھجلی ہونے لگی اور وہ اپنے سر کے بال نوچنے میں ایسا مصروف ہوا کہ اس نے اپنا پیغام بلا انجام ختم اور تمام کر دیا۔

دونوں دوست سامنے سے آنے والے ایک بھینسے سے لڑتے لڑتے بچ گئے

یہ موقع غنیمت جان کر شیخ چلی نے فوراً ایک نیا موضوع چھیڑ دیا۔ "اے سیاحِ منزل بیزار سفرِ آخرت پر روانہ ہونے سے پہلے آپ ابھی کون کون سے سفر اور کرنا چاہتے ہیں۔"

سندباد نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ "میرا ارادہ دنیا سے دست بردار ہو کر اپنی زندگی کے آخری ایام خدمتِ خلق میں گذارنے کا ہے۔"

"تو اس کے لئے آپ نے کون سا پنج سالہ پلان بنایا ہے؟" شیخ چلی نے پوچھا سندباد کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا "خدمتِ خلق کی منزل کو بہت سے راستے جاتے ہیں۔ میں یا تو کسی مل کا مالک بنوں گا۔ یا صوبائی اسمبلی کا وزیر یا کسی بڑے آدمی کا داماد اور پھر کچھ نہیں تو کسی درگاہ کا سجادہ نشین ہی بن بیٹھنے پر قناعت کر لوں گا۔ بہرحال کسی نہ کسی راستے سے میں اپنی منزل پر پہونچ کر ہی دم لوں گا۔"

شیخ چلی نے لقمہ دیا۔ "اگر آپ ایک پولٹری فارم یعنی مکمل مرغی خانہ بالتصویر کھول دیں تو آپ کا کیا بگڑ جائے گا؟"

غصے سے سندباد کا منہ سرخ ہو گیا۔ لیکن اس نے عدم تشدد کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے گرج کر جواب دیا۔ "مجھے آپ ایک انڈا نظر آتے ہیں۔"

"شکر خدا کا آپ نے مجھے پہچان تو لیا۔ ورنہ میں تو آوازیں دیتا دیتا تھک چکا تھا۔" ایک گونجتی ہوئی آواز کہیں قریب ہی سے سنائی پڑی۔ سندباد اور شیخ چلی نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ان کا لنگوٹیا یار علی بابا اپنے عالیشان مکان کے برآمدے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سندباد اپنے دوست سے ملنے کے لئے بے تحاشا مکان کے پھاٹک کی طرف بھاگا۔ شیخ چلی نے اس کی پیروی کرنی چاہی لیکن دفعتاً درمیان میں ایک دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ٹرک آ کر رک گئی اور وہ پھاٹک

سمجھ کر اسی میں گھس پڑا۔ ٹرک نے دفعتاً فراٹا بھرا اور ایک نامعلوم منزل کے لیے روانہ ہو گئی۔

برکت ایک چھینک کی

میری بھابھی جان ساری دنیا کے لئے تو بہت خلیق، با مروت اور ہنس مکھ واقع ہوئی تھیں لیکن صرف مجھ سے یعنی اپنے اکلوتے دیور سے جو اپنے والدین سے دور ان کی اور بھائی صاحب کی سرپرستی میں، زیر تعلیم تھا، ہر وقت منہ پھلائے رہتیں اور خدا لگتی پوچھئے تو اس میں ان کا قصور کم اور میرا پاجی پن زیادہ تھا۔ میرے اس پاجی پن میں در پردہ بھائی صاحب کی شہ اور ہمت افزائی بھی شامل تھی۔

بھابھی جان کی ایک بہت چہیتی چھوٹی بہن شمیم تھی جو میری ہی طرح بی اے کی طالب علم تھی۔ اس کی تعریف و توصیف کرنے اور نت نئے گن گانے سے ان کا منہ کبھی نہ تھکتا۔ بات چاہے ایران اور توران کی ہو رہی ہو لیکن وہ کسی طرح کوئی پہلو نکال کر اپنی "شمو" کی شان میں کوئی بے ساختہ قصیدہ ضرور پڑھ دیتیں۔ "میری شمو یہ کام ایسے کرتی ہے۔" "میری شمو وہ کام ویسے کرتی ہے۔" "مجال کیا جو میری شمو کے سر سے دوپٹہ سرک جائے۔" "میری شمو کی تہذیب اور شائستگی میرے یہاں سارے قصبے میں مشہور ہے۔" "بڑے بڑے باورچی اور رکاب دار میری شمو کے پکائے ہوئے کھانے پر اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔" "فلاں درزی کے سئے ہوئے کپڑے میں میری شمو نے ایسا نقص نکال دیا کہ وہ بس جھیپ کر کلا بتو ہو گیا۔" "میری شمو اپنے درجے ہمیشہ اول آتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ ہو سکتا تھا کہ میں یہ سب کچھ سنتا اور خاموش رہتا اور بھابھی جان سے

بدمزگی نہ مول لیتا۔ لیکن نہیں معلوم کیوں شمیم کی مدح سرائی سنتے سنتے مجھے اس سے ایک قسم کی چڑھ اور کدورت سی ہوگئی تھی۔ اور جیسے ہی بھابھی جان اس کی کوئی نئی خوبی بیان کرنے لگتیں میں خود اس خوبی میں سیکڑوں کیڑے ڈالنے اور اس کو خوبی کے بجائے خرابی ثابت کرنے لگتا، یا پھر اس کے متعلق ایسے مضحکہ خیز اور طنز یہ سوال کرنے لگتا کہ بھابھی جان فوراً برہم اور برافروختہ ہوکر مجھ پر نکتہ چینی اور میری ہجو کرنے پر اتر آتیں۔ اور پھر جب بات بہت زیادہ "ذاتیات" تک پہونچ جاتی تو بھائی صاحب ہنستے ہوئے بھابھی جان سے فرماتے" تم سے ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ تم اس حاسد کے سامنے شمیم کا ذکر ہی مت کیا کرو۔" اور مجھ سے آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہتے "ٹھیک تو کہتی ہیں تمہاری بھابھی تم سینما بہت جاتے ہو اور ہر وقت اپنی کتابیں پڑھنے کے بجائے اِدھر اُدھر کی فضول ناولیں اور رسالے دیکھا کرتے ہو۔" اور ان کی باتوں سے بھابھی، اور لہجے سے میں، مطمئن ہوکر اپنی لفاظی کی کبڈی کسی آیندہ موقع کے لئے ملتوی کر دیتے۔

ایک روز ناشتے پر میرے ہاتھ میں ایک باتصویر انگریزی رسالہ دیکھ کر بھابھی جان بولیں "میری شمو تو اس قسم کے رسالوں پر تھوکتی بھی نہیں۔"

"اسی وجہ سے تو اس رسالے کی اشاعت ایک لاکھ سے بھی زائد ہے۔" میں نے کہا۔ نہیں معلوم کیوں اس روز بھابھی جان کچھ خاص طور سے بھری بیٹھی تھیں لہٰذا بلا کسی تمہید کے فوراً ذاتیات پر آگئیں۔ "صرف سوٹ پہن لینے اور انگریزی بال بنا لینے سے انسان مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں ہو جاتا ہے اس کے لئے قابلیت اور ذہانت چاہیئے۔ اور اس میں ماشا اللہ آپ بالکل ہی صفر ہیں۔" اور پھر اس کے بعد انھوں نے میرے انگریزی بالوں کو میری حماقت، میری فیشن پرستی کو میری جہالت میری سنیما بینی کو میرے شہدپن اور میرے باتصویر رسالوں کے

مطالبہ کو میری بیہودگی اور بدتمیزی سے تعبیر کر ڈالا۔

ان کا حملہ کچھ اس قدر غیر متوقع اور بے محل تھا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ اس کو میری بے غیرتی سے منسوب کرتے ہوئے وہ اور بھی جلبلا گئیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھے اور کچھ کہتیں درمیان میں بھائی صاحب کے منہ سے نہیں معلوم کیسے یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ نکل گیا "تم اس کی تربیت کے لئے شمیم کو اس پر کیوں نہیں تعینات کر دیتیں یہ اس کے چیلوں کی زد میں اگر خود بخود سدھر جائے گا"۔ یہ جملہ ایک پٹاخا ثابت ہوا اور بھابھی جان واقعی غصے میں آکر کسی زخمی شیر کی طرح بپھر اٹھیں خوب خوب صلواتیں انھوں نے مجھ کو۔ بھائی صاحب کو، بلکہ میرے خاندان کو سنا ڈالیں اور بار بار ٹیپ کے بند کے طور پر کچھ اس قسم کے کلمات دہراتیں" یہ منہ اور مسور کی دال "! " کوے کی چونچ میں انگور" میری شمو کے دشمنوں کے منہ میں خاک "! " میں اپنے جیتے جی تو اپنی شمو کو کسی کھٹو کے حوالے کر نہیں سکتی۔ ابھی ہی اس کی قسمت پھوٹی ہے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا داب کر رکھ دوں گی"! وغیرہ وغیرہ۔ بڑی مشکل سے بیچارے بھائی صاحب انھیں قائل کر سکے کہ خدانخواستہ ان کا روئے سخن کسی نسبت یا رشتے کی طرف نہیں تھا بلکہ انھوں نے محض تفریحاً اپنا جملہ معترضہ کہہ دیا تھا ورنہ کہاں شمیم ایسی ہمہ صفت موصوف لڑکی اور کہاں ان کے بھائی جیسا بانگڑ ولڑکا؟

ایک روز شام کو گھوم پھر کر میں گھر پہونچا تو دیکھا کہ ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے اور گھر کا ہر فرد خواہ چھوٹا ہو یا بڑا انتہائی انہماک سے گھر کی صفائی اور آرائش میں مشغول ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل شمو بی بی آرہی ہیں اور ان کے استقبال کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ میری صورت دیکھتے ہی بھابھی جان نے "حکم امتناعی"

سنا دیا" دیکھو میاں! کل شمو آ رہی ہے۔ وہ تم سے پردہ کرتی ہے لہٰذا تم باہر اپنے کمرے ہی میں رہنا۔ میں تمہارا ناشتہ اور کھانا وہیں بھجوا دیا کروں گی۔ اندر نہ آنا اور ہاں باہر سبزے پر بھی نہ نکلنا کیونکہ جاڑوں کے دن ہیں اکثر ہم لوگ نکل کر دھوپ میں بیٹھیں گے"۔ میں نے بڑی سعادت مندی سے "بہت اچھا" کہا تو میری سزا میں کچھ تخفیف کر دیئے جانے کی امید دلا دی گئی۔ "ارے چار پانچ روز کی تو بات ہے۔ تم کو تکلیف تو ضرور ہو گی لیکن پھر کیا کیا جائے؟ اتنی مختصر تو کوٹھی ہے"۔ میں نے پھر بڑی شرافت سے جواب دیا" مجھے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ آپ بالکل فکر نہ کیجیے"۔

شمیم آئی تو واقعی ساری کوٹھی پر ایک نشاط انگیز فضا چھا گئی۔ اس نے میرے آٹھ سال کے بھتیجے جمال اور چھ سال کی بھتیجی حمیدہ کے ساتھ خوب ہڑ دنگا اور شور و غل مچایا۔ میرے حصے میں صرف چند نقرئی قہقہوں کی جھنکار آئی اور بس جمال اور حمیدہ سے کرید کر پوچھا تو پتا چلا کہ ان کی خالہ در اصل شیطان کی خالہ واقع ہوئی ہے۔ اپنی شوخی اور شرارت سے ہر وقت وہ کھلکھلاتی رہتی اور کسی وقت بھی نچلا بیٹھنا تو وہ جانتی ہی نہیں ہے۔

ایک روز میں یونیورسٹی سے پلٹا تو اپنے کمرے کو ایک عجیب و غریب حالت میں پایا۔ معلوم ہوتا کہ پانی پت کی چوتھی لڑائی میرے ہی کمرے میں میری کتابوں، جوتوں کپڑوں اور کرسی میزوں وغیرہ سے لڑی گئی تھی۔ میں نے کمرے کی ہر چیز کو الٹ پلٹا حتیٰ کہ دیوار پر تصویروں کے بجائے جوتے ٹنگے ہوئے تھے اور جوتوں کی جگہ تصویریں اوندھی پڑی تھیں۔ بے ترتیبی اور انتشار کا ایک عجیب عالم تھا۔ میرا لحاف زمین پر پلنگ کے نیچے قالین کی جگہ بچھا ہوا تھا۔ قالین کو الگنی پر پھانسی دیدی گئی تھی۔ ایک چادر میں بکس سے نکال کر میری کپڑے گنجیٹ دیئے گئے تھے اور بکس میں ردی

اخبارات بڑی احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پہلے تو دل چاہا کہ بھابی جان کو بلا کر یہ حماقت افزا منظر دکھاؤں لیکن پھر میری حمیت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ آتش دان پر رکھی ہوئی میری تصویر کے بڑی بڑی مونچھیں بنا کر عینک لگا دی گئی اور روشنائی گرا کر ایک آنکھ سے محروم کر دیا گیا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا "حمیدہ کے چچا جھگڑی مل گھامڑ داس"۔

دوسرے دن میں نے اپنا کیمرہ نکالا اور دوپہر میں جب کہ سارا گھر سمجھ رہا تھا کہ میں یونیورسٹی گیا ہوا ہوں اور شمیم باہر سبزے پر جمال اور حمیدہ کے ساتھ اچک پھاند میں مصروف تھی میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے اس ٹوٹے ہوئے شیشے سے جو اکثر دوسرا شیشہ دیکھ کر واپسی پر کھڑکی کی سٹکنی کھولنے اور کمرے میں داخل ہونے میں بڑی مدد دیتا، شمیم کی مختلف زاویوں سے تصویریں اتارنا شروع کر دیں۔ میں تصویریں اتارتا جاتا اور ان کے عنوانات میرے ذہن میں خود بخود ابھرتے جاتے۔ "دوپٹے سے رسہ کشی"، "کیچڑ میں مینڈک" "جھاڑی میں خرگوش" "پردے کا زردہ" "شمیم بانو ایک باتصویر فلمی رسالے پر تھوک رہی ہیں" وغیرہ وغیرہ اور پھر دوسرے ہی دن حمیدہ کی معرفت ان تصویروں کی ایک ایک کاپی عنوانات کے ساتھ شمیم کے پاس بھیج دی گئی۔ جمال نے اس کو یہ دھمکی بھی سنا دی "ان تصویروں کی ایک ایک نقل اور ساتھ میں چچا جان کی وہ تصویر جو آپ نے خراب کی تھی امی جان کو بھی پہونچنے والی ہے"۔۔۔۔ اس کے بعد میرے کمرے پر کوئی دوسرا حملہ نہیں کیا گیا۔

اور پھر جب کہ دوسرے دن شمیم واپس جا رہی تھی رات میں ایک خوشگوار قسم کا بہت ناخوشگوار حادثہ پیش آ گیا جس سے اس کے سامنے میری شرافت کی

رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو گئی۔

آٹھ بجے رات کو ایک دم سے پوری کوٹھی کی بجلی فیل ہو گئی۔ میں بھائی صاحب کے پاس برآمدے میں بیٹھا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ سامنے لائبریری میں جا کر آتش دان پر سے ان کی ٹارچ اٹھا لاؤں۔ لائبریری میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں ہاتھ بڑھائے ہوئے آگے بڑھا تو میرا دایاں ہاتھ کسی کے ملائم چہرے پر پڑا اور پھر ایک نازک سی عینک میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں پیچھے دبا اور ساتھ ہی مجھے ایک گلو گیر چیخ سی سنائی دی۔ میں نے لپک کر ٹٹولتے ہوئے ٹارچ اٹھا لی۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ شمیم آنکھیں جھپکاتے ہوئے لال پیلی ہو رہی تھی میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کو اس کی عینک پیش کی لیکن قبل اس کے کہ میں کوئی معذرت کر سکوں اس نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے اپنی عینک نوچ لی اور پیر پٹخ کر "لوفر" "بدمعاش" کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے روز وہ اپنے گھر واپس چلی گئی اور میرے لئے میری حماقت کی ایک تلخ یاد باقی رہ گئی البتہ میں اس بات پر یقیناً اس کا شکر گزار تھا کہ اس نے اس واقعہ کا کوئی ذکر بھابھی جان سے نہیں کیا ورنہ نہیں معلوم مجھ پر کون سی قیامت گزر جاتی۔

بھابھی جان کے مرحوم چچا میرے پھوپھا تھے۔ امتحان ختم ہو جانے کے بعد جب میں گھر جانے لگا تو بھائی صاحب کی ہدایت پر میں علیگڑھ اپنی پھوپھی سے ملنے گیا۔ باہر بیٹھکے میں بھابھی جان کے والد مولانا عبدالقدوس صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ بڑی شفقت اور تپاک سے ملے۔ بڑی دیر تک مجھے بہت سی نصیحتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک چھوٹے سے لڑکے کی رہبری میں مجھے میری پھوپھی کے

پاس بھیج دیا۔

عبدالقدوس صاحب کا پرانے زمانے کا بنا ہوا بڑا عالی شان مکان تھا اور اب غالباً اس کا تین چوتھائی حصہ غیر آباد تھا۔ میرا رہبر لڑکا پہلے تو مجھے پردے سے ایک وسیع صحن میں لے گیا جس کے سامنے ایک شاندار بچبوترا اور چاروں طرف تدواریاں بنی ہوئی تھیں۔ پھر وہ ایک زینے پر چڑھا، اس کے بعد ایک کوٹھے پر سے گزر کر وہ داہنی طرف مڑ گیا۔ میں وہاں پہونچا تو وہ ایک دم سے غائب ہو چکا تھا اور میں اس شعر کی تفسیر بن کر رہ گیا تھا ؎

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

اس موڑ پر میرے سامنے دو دروازے تھے۔ میں دونوں دروازوں پر خوب کھٹکھٹارا۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ پیر پٹخنے "ابے او لڑکے" چیخا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے واپس ہونے پر بھی راستہ بھول جانے کا احتمال تھا کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ یہ مکان کیا پوری بھول بھولیاں تھا۔ چار و ناچار میں ایک دروازہ کھول کر آگے بڑھا۔ سامنے پھر ایک بڑا صحن تھا لیکن اس کے داہنے کونے پر جو دروازہ تھا اس سے آبادی کے کچھ نشانات ظاہر ہوتے کیونکہ دو قطاروں میں پھولوں کے کئی گملے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اس دروازے پر دستک دی تو اندر سے شمیم کی آواز آئی "کون ؟" میں نے پٹ کھول کر ذرا سا جھانکا تو شمیم سامنے نیچی کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہلے تو چونک پڑی لیکن پھر اس نے تعجب سے تیوریاں چڑھالیں۔

میں نے کہا "سلام علیکم"۔

اس نے جواب دیا "وعلیکم السلام! اس وقت یہاں آپ کی شان نزول کیا

ہے ؟"

میں نے کہا " راستہ بھٹک کر منزل مقصود پر پہونچ گیا ہوں "۔

وہ آنکھیں نکال کر مصنوعی غصے سے بولی "کیا مطلب آپ کا ؟ "

میں " ایک چھوٹے سے لڑکے کی رہبری میں پھوپھی جان کے پاس جا رہا تھا لیکن وہ لڑکا درمیان ہی میں کہیں غائب ہو گیا اور میں بھٹک کر آپ تک پہونچ گیا ۔"

شمیم ۔ " تو جائیے جس دروازے سے آپ یہاں تک آئے ہیں اسی کے برابر والا دروازہ امی جان کے کوٹھے پر کھلتا ہے ۔"

میں ۔ " لیکن مجھے آپ سے ایک معافی بھی مانگنا ہے ۔"

شمیم ۔ " تو جلدی سے مانگ لیجئے اور تشریف لے جائیے ۔ غالباً آپ کو اس کا احساس نہیں کہ میرے اور آپ کے درمیان سرکاری طور سے پردہ ہے اور آپ کا اس طور سے میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہونا انتہائی معیوب ہے ۔"

میں ۔ " اچھا تو میں کمرے کے اندر حاضر ہو کر معافی مانگے لیتا ہوں ۔" اور میں کمرے میں اندر داخل ہو کر اس کی کرسی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا ۔

شمیم ۔ (گھبرا کر) " ہٹائیے یہ معافی وغیرہ کی باتیں ۔ اب آپ تشریف لے جائیے کوئی آ جائے گا تو کیا کہے گا ۔"

میں ۔ " آپ اپنی بد اخلاقی کا الزام کسی دوسرے پر کیوں تھوپنا چاہتی ہیں ؟"

شمیم ۔ " آئے تھے آپ معافی مانگنے اور الٹا مجھی کو بد اخلاق بنا رہے ہیں ۔"

میں ۔ " اس روز اندھیرے کے حادثے کا ذمہ دار صرف اندھیرا تھا ۔"

شمیم ۔ " اور تصویریں خود بخود کیمرے میں اتر آئی تھیں ۔"

میں۔" اور میرے کمرے میں شاید کسی بھوت نے گھس کر غدر مچایا تھا۔"
شمیم۔" اس کار خیر میں محلے کی کئی لڑکیاں شریک تھیں !"
میں۔" اور جن کی رہنمائی آپ نے فرمائی تھی ؟"
شمیم۔" (ہنستے ہوئے) اچھا بھکڑ ہی لال گھامڑ داس جی ! اب یہ انٹرویو ختم ہو جانا چاہیئے۔"
میں۔" بشرطیکہ آپ ایک دفعہ پھر مجھے لوفر اور بدمعاش کہہ دیں۔"
شمیم۔" سمجھ لیجیئے کہ کہہ دیا۔ لیکن اب خدا کے واسطے جایئے۔ آپ جانتے ہیں کہ والد صاحب پردے کے کس شدت سے پابند ہیں۔"
اور پھر دفعتاً باہر صحن میں بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور کسی نے پکارا "شمیم !"
"جی ! ابا جان" شمیم نے بدحواسی سے جواب دیا۔ میں سراسیمہ کھڑا تھا۔ قدموں کی آواز قریب تر ہو گئی۔ شمیم نے انتہائی گھبراہٹ میں مجھے اشارا کیا اور میں غڑاپ سے صوفے کے پیچھے چھپ گیا۔
مولانا عبدالقدوس صاحب کمرے میں آ کر اسی صوفے پر جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا بیٹھ گئے اور گھر کی کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے" آج نسیم کا دیور اپنی پھوپھی سے ملنے آیا ہے۔ ٹھیک ہی کہتی تھی وہ عجیب بدشکل لڑکا دکھائی پڑتا ہے۔"
اور عین اس موقع پر روکنے کی انتہائی کوشش کے باوجود میں ایک زبردست چھینک چھینک دیا ! ——————
مولانا عبدالقدوس صاحب غالباً ایک فٹ صوفے کے اوپر اچھل گئے۔ کیونکہ ہوا میں پرواز کے چند لمحوں کے بعد جب وہ صوفے پر واپس گرے تو

اس کا ہر اسپرنگ بے اختیار چیخ اٹھا تھا۔ شمیم منہ پھیر کر صوفے کے ایک کونے میں گر گئی اور میں سر جھکا کر خاموشی سے یوں کھڑا ہو گیا جیسے ع

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

پردے کے زبردست حامی مولانا عبدالقدوس نے اس معصوم ڈرامے سے یقیناً بدترین نتائج اخذ کئے تھے۔ ان پر ایک دم سے شدید قسم کا پاگل پن کا دورہ پڑ گیا "شیطانو! ملعونو! کمبختو! تم نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ میری ناک کاٹ لی ––– میرے چہرے پر سیاہی مل دی!" وغیرہ وغیرہ۔ "وہ چیخے گرجے۔ تڑپے اور پھر انھوں نے اپنے سر کے بال اور داڑھی نوچ کر رکھ دی۔ شمیم نے سسکیوں کے درمیان کچھ کہنا چاہا تو انھوں نے لپک کر اس کے ایک چھڑی رسید کی میں بچانے کے لئے آگے بڑھا تو مجھ پر تابڑ توڑ کئی چھڑیوں کی بارش سی ہو گئی۔ میں فرش پر گرا تو کئی لاتوں سے ضیافت کی گئی ––– "کمینہ ––– آوارہ۔ بدمعاش جہنمی" اور نہیں معلوم کن کن خطابات سے سرفراز کیا گیا۔

کافی مار دھاڑ کے بعد مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا "چل باہر ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں تجھے۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی شریف کی ناموس میں بٹہ لگانے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟" میں نے لاکھ کچھ کہنا چاہا مولانا کچھ سننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ میں جیسے ہی بولنے کے لئے منہ کھولتا وہ فوراً لپک کر تھپڑ رسید کر دیتے۔ مارتے کوٹتے وہ مجھے ایک دوسرے کوٹھے پر لے گئے اور ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا۔

میں سمجھتا تھا کہ اس کوٹھری سے براہ راست مجھے کسی جلاد کے پاس مقتل گاہ بھیج دیا جائے گا۔ لیکن چند ہی گھنٹوں بعد مجھے اس سے نکال کر ایک قاضی اور چند گواہوں کے سامنے پیش کیا گیا اور میرا اور شمیم کا باقاعدہ نکاح ہو گیا! مولانا

عبدالقدوس صاحب نے یہ بھی ایک نادری حکم لگا دیا کہ ہم دونوں میاں بیوی شام تک ان کا گھر خالی کر دیں۔ جہیز کے طور پر انھوں نے انتہائی حقارت سے ایک دستاویز مجھے گھسیٹ ماری جس میں انھوں نے بیشتر ہی سے اپنی کل جائداد اپنی دونوں لڑکیوں نسیم (بھابھی جان) اور شمیم کو دے رکھی تھی۔

ریل میں شمیم کبھی روتی کبھی ہنستی اور کبھی میری چوٹوں پر مرہم لگاتی۔ بھائی صاحب اور بھابھی جان کے سامنے جب ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے پیش ہوئے تو بھائی صاحب مارے خوشی کے چیخے "کوے کی چونچ میں انگور" بھابھی جان کچھ دیر تو سکتے میں رہیں پھر ایک ہاتھ سے "میری شمو" کہہ کر شمیم اور دوسرے ہاتھ سے "میرا بنو" کہہ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

واضح رہے کہ کچھ عرصے بعد مولانا عبدالقدوس صاحب سے بھی صفائی ہو گئی اور انھیں جب صحیح واقعے کا علم ہوا تو بہت ہنسے اور اپنی داڑھی میں خلال کرتے ہوئے فرمایا "جب میں صوفے پر بیٹھا تمہیں بوکھل کہہ رہا تھا تو صوفے کے پیچھے تم پر کیا گذر رہی تھی" میں نے بڑے ادب سے جواب دیا "میں دنیا کی سب سے قیمتی چھینک روکنے کے لئے اپنی ناک اُمیٹھ رہا تھا"۔ مولانا نے قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا "واقعی ہم دونوں ہی کی ناکیں سخت خطرے میں پڑ گئی تھیں۔"

نیند کیوں نہیں آتی؟

اس زندگی پر کچھ ایسی نحوست سوار ہے کہ ہر وہ شے جس کی تمنا کی جاتی اور بلائی جاتی ہے وہ ہمیشہ صورت سے بیزار اور بھاگتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مظلوم اور قابل ہمدردی بیچارا شاعر ہے۔ محبوب نہیں آتا، شب وصل نہیں آتی، بہار نہیں آتی، خود اپنی خبر نہیں آتی، قاصد خط لے کر جاتا ہے تو وہ پلٹ کر نہیں آتا، اور نیند تو شاید محبوب کی بھی چچی ہے اس نے تو نہ آنے کی بالکل قسم ہی کھا رکھی ہے اور تو اور موت، جو یوں تو ہر گھڑی کسی بے صبرے قرض خواہ کی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتی، جب بلائی جاتی ہے تو اس وقت تک نہیں آتی جب تک بہت سے شاعروں کی چھتیس نہیں اڑا لیتی۔

اور بن بلائے مہمان ہر گھڑی سر پر سوار رہتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ سویرے سویرے رقیب روسیاہ کا منہ دیکھنے کو نہ ملے، محبوب کا در کبھی دربان سے خالی نظر نہیں آتا، رہزنوں کے خوف سے کسی بھی سمت بھاگیے آخر میں انھیں کے پاؤں دابنا پڑتے ہیں، صیاد، بندر پکڑنے کا جال پھیلائے باغ میں ہر گھڑی چوکنا دکھائی پڑتا ہے اور خواہ کیسے ہی چھپ چھپا کر جاؤ میخانے سے نکلتے ہی پہلی مڈبھیڑ واعظ ہی سے ہو جاتی ہے۔

نیند ہمیشہ ایک جنس کمیاب رہی ہے اور بہرحال ان لوگوں کے حصے میں یہ ذرا کم آتی ہے جن کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یہ آسانی سے

ہاتھ آجایا کرتی تو ہمارے شعراء نہ اختر شماری کر پاتے نہ طول شب فراق ناپ سکتے۔ نہ شمع کے ساتھ بیٹھ کر آنسو بہا پاتے۔ اور نہ آخر شب بسمل کی تڑپ والا تماشہ بلا ٹکٹ دیکھنے کو میسر آتا۔ مرزا غالب ایک مرتبہ ذرا سا اونگھ گئے تھے تو ان کے معشوق نے ایک ایسا چٹکلا چھوڑ دیا کہ پھر بیچارے کو اپنا لپٹا ہوا بستر کھولنے کی زندگی بھر ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

یوں تو مرزا غالب کو نیند بلانے کی دوا بھی معلوم تھی اور اس کی ترکیب استعمال بھی۔

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

لیکن بدقسمتی سے یہ دوا خود ان کے ہاتھ کبھی نہیں لگی اور وہ بے خوابی کو نالاں اور پریشاں عمر بھر یہی فریاد کرتے رہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں نہ عاشق ہوں نہ زاہد شب زندہ دار، نہ چور ہوں نہ خدائی فوجدار لیکن اس کے باوجود مجھے نیند نہیں آتی آخر کیوں؟ اس کا سبب دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی یعنی بچے! جو ایک ہی وقت میں سرمایۂ حیات بھی ہوتے ہیں اور شامت اعمال بھی نور چشم بھی ہوتے ہیں اور درد جگر بھی۔

کچہری سے تھکا ہارا گھر واپس آیا تو شام کا اندھیرا ہو چکا تھا حسب معمول سب سے پہلے آنریری مجسٹریٹ بن کر بچوں کے مقدمات سننا شروع کر دیئے جن

میں مستقل طور سے بیگم سرکاری وکیل اور یکے بعد دیگرے سب بچے ملزم ہوتے جو بوقت ضرورت ایک دوسرے کے خلاف سرکاری گواہوں کے فرائض بھی انجام دیتے جاتے۔ مقدمات نہ صرف پیچیدہ بلکہ ایک دوسرے سے ایسے الجھے ہوئے ہوتے کہ ان کا فیصلہ کرنا تو درکنار ان سے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ صابن کی بٹی تسلے کے پانی میں کیسے گھل گئی؟ نعیم نے پھینکی تھی یا وہ خود اچھل کر تسلے میں جا گری تھی؟ پھر اس کو پانی سے نکالنے سے پہلے کون بسکٹ لینے بھاگ گیا تھا۔ کس نے کس کے بسکٹ کھا لئے تھے۔ کبوتر کس نے ہشکائے تھے۔ روشنائی کون گرا رہا تھا۔ آئینہ کون کس سے چھین رہا تھا اور پھر وہ کس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹا تھا۔ پاندان کس نے الٹ دیا تھا۔ اور کتھے کی کلھیا کس نے چاٹ کر صاف کر دی تھی۔ ایک ایک بات سے دس دس دم چھلے پھوٹ رہے تھے۔ چنانچہ آخر میں بلا کسی فیصلے کے سب مقدمے داخل دفتر کر دیئے گئے۔ عدالت اور سرکاری وکیل یعنی مجھ کو اور بیگم کو دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑ رہا تھا کہ مجرم ہیں تو صرف ہم دونوں۔ بچے بیچارے تو سب بے گناہ ہیں۔

ع دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

تھک زیادہ گیا تھا اس لئے نو بجے ہی بستر پر اس نیت سے لیٹ گیا کہ آج جلد سو جاؤں گا۔ محترمہ نیند بھی خلاف معمول کچھ مہربان نظر آئیں چنانچہ بچوں کے خاموش ہوتے ہی بہت جلد میں کچھ ایسا بے سدھ ہو گیا کہ اگر سو نہیں گیا تو جاگ بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن شاید چند منٹ بھی یہ حالت نہیں رہنے پائی تھی کہ سودا کی بالیں پر شور قیامت اٹھنے کا مضمون درپیش ہو گیا۔ پہلے ایک مبہم سا شور سنائی دیا پھر یہ شور بہت ہی پُر زور ہوتا چلا گیا۔ معلوم ہوتا جیسے محلے میں ڈاکو بلکہ ایک پوری فوج مختلف سمتوں سے گھس آئی ہو جس کا ہر سپاہی حلق پھاڑ پھاڑ

کر چیخ رہا ہو اور پھر اس شور سے زندہ باد اور مردہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند ہونے لگے۔

میں کہاں تو سونے لیٹا تھا اور کہاں بستر سے کود کر برآمدے میں جا پہونچا۔ میری طرح بہت سے ہمسائے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ نصیبن بوا کی مرغی شام سے لاپتہ ہو گئی تھی اور محلے کے چند ہونہار بچے بوائے اسکاؤٹ بنے اس کو تلاش کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اس نیک کام میں بہت سے بچے شریک ہو گئے تھے اور انھوں نے ایک جلوس کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پھر ایک ایسی مرغی مل گئی تھی کہ جس کے بارے میں ایک گروہ کہتا تھا کہ وہ نصیبن بوا کی ہے اور دوسرا کہتا کہ ان کی نہیں ہے اس اختلاف کا فیصلہ زندہ باد اور مردہ باد کے نعروں سے کیا جا رہا تھا کیونکہ ہماری سودیشی جمہوریت میں جمہوری فیصلے اب شور وغل اور بیا ڈگی ہی سے کئے جاتے ہیں۔ یہ ہنگامہ قریب ایک گھنٹے تک جاری رہا اور جب محض نعروں سے مرغی کی ملکیت کا خاطر خواہ فیصلہ نہیں ہو سکا تو ڈھیلے بازی شروع ہو گئی اور میرے جیسے تماشائی اپنے اپنے گھروں میں بھاگ جانے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے بعد بستر پر جو لیٹا تو اپنے آپ کو نیند کے بجائے ریڈیو کے نغموں پر جھولتا ہوا پایا۔ گھر کے داہنی جانب رخت سفر باندھا جا رہا تھا "چلے ہیں چلے ہیں سرکار کی دولہا بن کر" اور بائیں جانب یہ نالہ وشیون بپا تھا کہ "یا اللہ یا اللہ، دل لے گئی!" ان تانوں کے درمیان جو خلط ملط ہو کر دماغ کو اور بھی ماؤف کر رہی تھیں نیند کیا اگر موت بھی آ رہی ہوتی تو وہ بھی الٹے پیروں بھاگ جاتی ـــــ

یہ تانیں ختم ہوئیں تو پاس پڑوس کے وہ بچے جو بغیر والدین کے رہتے

سینما دیکھ کر یا گھوم پھر کر واپس آنا شروع ہو گئے۔ "بہار و پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔" گاتے ہوئے کوئی صاحبزادے زینے پر چڑھ رہے تھے اور "جو وعدہ کیا ہے نبھانا پڑے گا" الاپتے ہوئے کوئی برخوردار اپنے جوتے کی ڈوریاں کھول رہے تھے۔ کوئی سپوت "لال چھڑی میدان کھڑی" گنگناتے ہوئے "یاہو" کی سماعت پاش چیخیں بلند کر رہے تھے۔ اچھی خاصی مدت تک میرے مکان پر کیا سارے محلے پر کسی میوزک کالج کی فضا طاری رہی اور پھر ایک حد تک خاموشی چھا گئی —

گھڑی پر نگاہ کی تو بارہ بج رہے تھے۔ سوچا کہ سب بلائیں تمام ہو چکیں اب مجبوراً سونا ہی پڑے گا چنانچہ اپنے اور سارے محلے کے بچوں کی خطاؤں کو نیک نیتی سے معاف کر کے اب واقعی سونے کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور ممکن ہے کہ ایک آدھ خراٹوں کے گنہ گار بھی ہو گیا ہوں کہ دفعتاً اپنے پلنگ کے نیچے پہلے کچھ سرسراہٹ اور پھر مرغی کے بولنے کی ایک مخصوص "قیں" سنائی دی پھڑپھڑا کر اٹھ بیٹھا، لیمپ جلایا اور ٹارچ سے پلنگ کے نیچے دیکھا تو نصیبن کی مرغی کو ایک کونے میں دبکا پایا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا؟ ہڑبڑا کر بیگم کو جگایا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ بدحواس ہو کر رہ گئیں۔ غالباً شام کو بچے اپنی مرغیوں کے ساتھ اس مرغی کو بھی ہنکا لائے تھے۔

پھر کیا ہوا؟ سنا ہے کہ سولی پر بھی نیند آجاتی ہے لیکن یقیناً ایک چوری کی مرغی، اور وہ بھی ایسی کہ جس نے زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگوا کر تھوڑی ہی دیر پہلے سارے محلے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا پلنگ کے نیچے چھپا کر نیند کا آجانا بالکل ہی ناممکن تھا۔ مرغی بھی ضرورت سے زیادہ کچھ ڈرتی تھی چنانچہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد طرح طرح کی آوازیں نکال کر دھمکاتی رہتی کہ اس

کی ایک چیخ محلے میں میری برسوں کی ساکھ پہ پانی پھیر دینے کے لئے کافی ہے۔ رات کے آخری حصہ میں بڑی حکمت عملی سے میں نے اور بیگم نے مرغی کو خاموشی سے پکڑ کر ایک تولیہ میں لپیٹا اور منہ اندھیرے اس کو بغل میں دبا کر گھر سے باہر نکلا۔ دروازے پہ ایک شناسا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ پوچھا "اتنے سویرے کہاں؟ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟" اور میں یہ چیخ کر "شرم تم کو مگر نہیں آتی" سر پہ پیر رکھ کر بھاگا۔

وقت کی قیمت

شاعر (گنگنا رہا ہے)

وقت آتا ہے، پھر نہیں آتا
وقت پھر کب پلٹ کے آتا ہے
وقت کو روکو! کہ چلا میں!
اے وقت ٹھہر! ساتھ چلوں گا!

(کتا بھونکتا ہے)

شاعر (جھنجلا کر) جب میں فکر سخن کرنے بیٹھتا ہوں یہ کتّے کا بچہ ٹامی ضرور بھونکنے لگتا ہے۔

بیوی۔ شاعر کا کتا ہے۔ کیا اتنا بھی سخن فہم نہ ہو؟

شاعر۔ یہ سخن فہمی نہیں بدمذاقی کی انتہا ہے۔

بیوی۔ آج پندرہ روز سے غریب ٹامی کو کھانسی آرہی ہے اور میں آپ سے کہتے کہتے تھک گئی ہوں کہ اسے لے جاکر کسی ڈاکٹر کو دکھا دیجئے۔ لیکن آپ کو فکر سخن ہی سے فرصت نہیں۔ جانور کی جان بھی اپنی ہی جیسی سمجھنا چاہیئے۔

شاعر۔ مجھے کھانسی آتی ہے تو میں کب ڈاکٹر کو دکھاتا پھرتا ہوں۔ کتے کی جان بھی میری ہی جیسی سمجھ لیجئے۔

بیوی۔ تو آپ کو اپنے علاج سے کون روکتا ہے۔

شاعر۔ اب آج مدت کے بعد ایک نظم لکھنے بیٹھا ہوں ــــــــــــــــ وقت کی قیمت ــــــ تو بیوی کے نور چشم کتے کو کھانسی شروع ہو گئی اور اسے اسپتال نہ لے جانے کے جرم میں مجھے پھانسی دی جا رہی ہے۔ کھانسی اور پھانسی! واللہ! کیا نپے تلے قافیے ہیں۔

بیوی۔ آپ کے نپے تلے قافیوں ہی نے تو سارے گھر کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ کوئی مرے یا جیئے آپ کی بلا سے۔ اس سے پہلے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر میری بکری مر گئی لیکن آپ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اب اسی طرح یہ کتا بھی اللہ کا پیارا ہو جائے گا اور آپ اپنی نظم ہی لکھتے رہ جائیے گا۔

شاعر۔ بس! بس! حد کر دی آپ نے احسان فراموشی کی! آپ کی بکری کی وفات حسرت آیات پر وہ معرکہ آرا مرثیہ لکھ دیا تھا میں نے کہ بڑے بڑے لیڈروں کو بھی نصیب نہ ہو سکا دیسا۔ اور آپ دیکھ لیجئے گا کہ نصیب دشمناں اگر مر گیا آپ کا کتا تو میں اسے زندۂ جاوید بنا دوں گا۔

بیوی۔ (خفا ہو کر) نوج! دشمنوں کے منہ میں خاک! مجھے آپ کا زندہ جاوید نہیں بلکہ اپنا یہی کتا چاہیئے۔

شاعر۔ تو آپ کو میری شاعری سے زیادہ اپنا کتا عزیز ہے۔ جائیے خدا کے واسطے مجھے تھوڑی کا دیر کے لئے تنہا چھوڑ دیجئے۔ اس وقت طبیعت کچھ موزوں ہے اور مجھے اپنی یہ نظم آج ہی مکمل کرنا ہے۔

بیوی۔ (روانسی آواز میں) میں تو دعا مانگتی ہوں کہ ٹامی کی آئی مجھکو آجائے اور میں تھوڑی دیر کے لئے کیا ہمیشہ کے لئے آپ کو تنہا چھوڑ دوں۔

شاعر۔ نہیں! نہیں! ایسے منحوس کلمات اپنی زبان سے نکال کر مجھے مت دہلائیے (خوشامدانہ لہجے میں) دیکھئے آپ بھی تو ایک ذرا سی بات کے لئے اپنی جان

بلکان کر رہی ہیں۔ گرم پانی میں نمک ڈال کر غرارہ کرا دیجئے بھلا چنگا ہو جائے گا آپکا کتا۔ اکثر مشاعروں کے بعد اس علاج نے مجھے فائدہ کیا ہے۔

بیوی۔ (روتے ہوئے) بس! بس! اب آپ اپنی ہمدردیاں جتانے کو رہنے دیجئے۔ کتا مر جائے گا تو آپ مرثیہ لکھ دیں گے میں مر جاؤں گی تو آپ کوئی مسدس تصنیف فرما دیں گے۔

شاعر۔ ارے! ارے! آپ تو واقعی رو رہی ہیں۔ آپ کی ہر خوشی پر میں اپنی جان تک قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کر سکتا۔ آپ کتے کو تیار کیجئے مطلب یہ کہ اسے کسی زنجیر یا رسی سے باندھ رکھیے، میں سب کام چھوڑ کر اسے ڈاکٹر کو دکھانے جاؤں گا۔ یقیناً جاؤں گا! لیکن ہاتھ جوڑتا ہوں کہ بس تھوڑی دیر کے لئے مجھے اپنی نظم مکمل کر لینے دیجئے۔

(بیوی جاتی ہے ــــ کتے کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں)

شاعر۔ (گنگناتا ہے)

وقت آتا ہے پھر نہیں جاتا — نہیں! نہیں!
وقت جاتا ہے پھر نہیں آتا
وقت پھر کب پلٹ کے آتا ہے؟
وقت کو روکو! کہ چلا ہیں
اے وقت ٹھہر! ساتھ چلوں گا
تیری سرعت کے مقابل اے وقت
موت کو . . . .

(دروازے پر آہٹ ہوتی ہے۔ شاعر خاموش ہو جاتا ہے اور پھر "کیا میں اندر آ سکتا ہوں" کی ایک ہانک کیساتھ شاعر کا دوست

کمرے میں داخل ہوتا ہے)

دوست۔ تسلیم!

شاعر۔ (مری آواز میں) تسلیم!

دوست۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟

شاعر۔ فرمایئے؟ کیسے ناوقت تکلیف فرمائی آپ نے؟

دوست۔ کچھ نہیں ایک ذرا سا کام تھا چلا آیا!

شاعر۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی؟

دوست۔ سب عنایت ہے آپ کی۔

شاعر۔ میرا مطلب یہ کہ مجھ ناچیز سے کیا کام تھا آپ کا؟

دوست۔ اجی ذرا اطمینان سے بیٹھنے تو دیجئے۔ کام بھی عرض کر دوں گا۔

شاعر۔ معاف کیجئے گا۔ اس وقت میں ایک بہت ضروری کام میں مصروف تھا۔ آپ اپنے کام سے جلد ہی مطلع فرما دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔

دوست۔ میرا کام کوئی ایسا ضروری نہیں ہے۔ آپ اپنا کام جاری رکھیئے۔

شاعر۔ مجھے ایک نظم لکھنا ہے، وقت کی قیمت،

دوست۔ تو آپ خود اپنے وقت کی قیمت کیوں گھٹا رہے ہیں۔ میرا کام تو کچھ یوں ہی سا ہے۔ ہو جائے گا۔

شاعر۔ (ٹھنڈی سانس بھرتا ہے) بھئی آخر بتایئے تو اپنا کام۔ مجھے الجھن ہو رہی ہے۔

دوست۔ میرے کام سے آپ بے فکر رہیئے۔ آپ اپنے کام کئے جایئے۔

(شاعر چند لمحے خاموش رہتا ہے۔ پھر کاغذات الٹنے پلٹنے لگتا ہے اور آخر میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیتا ہے)

شاعر۔ آخر کیسے آنا ہوا اس وقت؟

دوست۔ آپ میرے کام کے خیال سے بیکار ہلکان ہوتے ہیں۔ آپ فکر سخن کر رہے تھے کیے جائیے۔

شاعر۔ فکر سخن کے لیے سکون قلب کی ضرورت ہے۔

دوست۔ تو میں آپ کے سکون قلب میں کب کوئی ہیجان پیدا کر رہا ہوں۔

شاعر۔ تو آخر بتا نہ ڈالیے اپنا کام۔ میں اختلاج قلب کا پرانا مریض ہوں۔

دوست۔ اسی لیے تو میں آپ کے کام میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ اپنا کام ختم کر لیجیے تو میں اپنا کام بھی عرض کر دوں گا۔

شاعر۔ کسی غزل کے متعلق مشورہ لینا ہے؟۔

دوست۔ غزل پر لعنت بھیجیے۔ میں اس حماقت کے پاس نہیں پھٹکتا۔

شاعر۔ کوئی مشاعرہ منعقد ہونے والا ہے شہر میں؟

دوست۔ اجی توبہ کیجیے۔ مجھے مشاعروں سے سخت نفرت ہے۔

شاعر۔ تو پھر کیا کام ہے آپ کا۔

دوست۔ کچھ نہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے۔

شاعر۔ میرا اخلاق کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ میں آپ کا کام معلوم کیے بغیر اپنا کام کیے جاؤں

دوست۔ (ہنستے ہوئے) اور میرا اخلاق کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ میں آپ کے کام کے دوران آپ کو کوئی زحمت دوں۔ بس اب آپ اپنے کام کا ہرج نہ کیجیے میں اس آرام کرسی پر لیٹ کر آنکھیں بند کیے لیتا ہوں۔

(دوست آرام کرسی پر لیٹ کر جاتا ہے کچھ دیر کے لیے خاموشی ہو جاتی ہے جس میں شاعر کی آہیں اور ٹھنڈی سانسیں سنائی دیتی ہیں اور پھر دوست کے خراٹوں کی آواز)

شاعر۔ (اپنے آپ سے) خود اس طرح کتے کی موت مرنے سے یہی بہتر تھا کہ میں ڈامی کو لے کر اسپتال ہی چلا جاتا۔

(شاعر پیر پٹختا ہے۔ کچھ کاغذوں کو پھاڑتا ہے۔ دوست کے خراٹے کچھ اور بلند ہو جاتے ہیں)

شاعر۔ (دوست کو جگاتے ہوئے) میرا کام تمام ہو چکا ہے اب خدا کے لئے اپنا کام بتا ڈالیے۔

دوست۔ (خوں خراٹ کر کے جاگتے ہوئے) آپ نے اپنا کام بند کیوں کر دیا۔ میرا کوئی ایسا کام نہیں ہے۔

شاعر۔ پھر بھی آخر؟

دوست۔ کچھ نہیں یوں ہی!

شاعر۔ بس اب زیادہ نہ ترسایئے۔

دوست۔ اجی کیوں آپ مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔

شاعر۔ (غصے سے بھرائی ہوئی آواز میں) واللہ ترسانے کی حد کر دی آپ نے!

دوست۔ آپ تو آج بالکل ہی تکلف پر اتر آئے ہیں۔

شاعر۔ اچھا مجھے اجازت دیجئے میں اپنی بیوی کا کتا لے کر اسپتال جا رہا ہوں۔

دوست۔ (خوش ہو کر) بہت خوب پھر تو راستہ آپ کی ہمراہی میں کٹ جائے گا تانگے پر آپ کے ساتھ میں بھی ایک طرف دبک جاؤں گا۔

شاعر۔ (بیوی کو آواز دیتا ہے) بیگم صاحب! کتا تیار ہو گیا ہو تو میں اُسے لے کر اسپتال ہی چلا جاؤں گا۔

بیوی۔ آپ کی نظم تو شاید ابھی ختم نہ ہوئی ہو گی۔!

شاعر۔ جی نہیں۔ لیکن میں خود ختم ہو رہا ہوں۔

بیوی۔ کتا تو رسی تڑا کر کہیں بھاگ گیا۔ تھوڑا انتظار کیجئے یا اُسے ڈھونڈھ لائیے!
شاعر۔ (بڑبڑاتا ہے) انسانوں سے زیادہ تو کتوں کو وقت کی قیمت کا احساس ہے۔
(دوست سے) کتا بھاگ گیا ہے۔ اب میں اسے تلاش کرنے جارہا ہوں)

دوست۔ کتنی دیر میں واپسی ہو گی۔
شاعر۔ (طنزاً سے) یہ سوال تو کتے سے کرنا چاہیئے کہ وہ کتنی دیر میں مل جائے گا۔
دوست۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں آپ کے کسی کام میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔
شاعر۔ (غصے سے) صاحب خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے اور بتا دیجئے کہ آپ نے
اس وقت کیسے اور کیوں تکلیف فرمائی۔
دوست۔ کچھ نہیں بس ذرا سا کام تھا چلا آیا۔
شاعر۔ تو اب وہ کام بھی فرما دیجئے نا۔ ورنہ آپ کے سر کی قسم میں پاگل ہو جاؤں گا
دوست۔ آپ ناحق بات کا تبنگڑ بناتے ہیں۔ میرا کام تو بس نہ ہونے کے برابر ہے۔
شاعر۔ (طنزاً) خیر آئیے۔ آج آپ موقع سے مل گئے ہیں تو آپ کو اپنی کچھ طویل
نظمیں سنا ڈالوں۔
دوست۔ (گھبرا کر) کیا اس وقت؟
شاعر۔ جی ہاں ابھی اور اسی وقت!
دوست۔ لیکن! میرا مطلب ہے کہ آپ تو شاید اپنا کتا تلاش کرنے جارہے تھے
شاعر۔ کتا تو پھر مل جائے گا لیکن گیا وقت پھر کہاں ہاتھ آتا ہے۔ نظم کا عنوان
ہے "بن بلائے مہمان" عرض کیا ہے . . . . . .
دوست۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) پھر کسی اور وقت نہ رکھیئے اسے!
شاعر۔ یہ میری سب سے پہلی آزاد نظم ہے لہٰذا اس میں میری موجودہ فن کارانہ
پختہ کاری تو نہیں ملے گی البتہ جذبات کی شدت اور تخیل کی ندرت ضرور

توجہ طلب ہے۔ عرض کیا ہے ......

دوست۔ معاف کیجئے گا ایک بڑا ضروری کام یاد آ گیا ابھی بیٹھے بیٹھے۔

شاعر۔ اجی کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کو یہ نظم اسی وقت اور ابھی سننا پڑے گی اور پھر یہ کچھ ایسی طویل بھی تو نہیں صرف ایک سو گیارہ بند ہیں اس میں۔

عرض کیا ہے۔

دوست۔ مگر!

شاعر۔ مگر وگر کچھ نہیں عرض کیا ہے ......

دوپہر تھی اک سنہری
خستہ میٹھی، دل فریب
مصروف تھا میں کام میں
پھنس گیا تھا دام میں
اتنے میں بس ناگہاں
سر پہ گرا یہ آسماں
اک خبیث دو جہاں
آ ہی گیا! آ ہی گیا!

دوست۔ بس بس! مجھے اب اجازت دیجئے۔ پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤنگا

شاعر۔ واہ حضرت! ابھی تو پہلا بند بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔

دوست۔ معاف کیجئے گا۔ لیکن اس وقت تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔

شاعر۔ صرف ایک شرط ہے! یعنی پہلے آپ کو بتانا پڑے گا کہ آپ اس وقت کس کام سے تشریف لائے تھے۔

دوست۔ جانے بھی دیجئے۔ پھر بتادوں گا کسی وقت۔

شاعر۔ تو پھر اطمینان سے بیٹھ کر میری نظم سنیئے اور اگر آپ نے جانے کے لئے زرا بھی جنبش کی تو میں قتل تو خیر کیا خودکشی ضرور کر لوں گا۔

دوست۔ (معذرت آمیز لہجے میں) کچھ نہیں مجھے زرا گھڑی کا وقت دریافت کرنا تھا۔

شاعر۔ (چیختے ہوئے) وقت! یعنی آپ گھڑی کا وقت دریافت کرنا چاہتے تھے مجھ سے؟ اور اس کے لئے دو گھنٹے سے میری روح قبض فرما رہے تھے۔

(دوست اٹھ کر تیزی سے بھاگتا اور کمرے سے نکل کر بڑے زور سے دروازا بند کر دیتا ہے۔ شاعر قہقہہ لگاتا ہے)

شاعر۔ کون کہتا ہے کہ میرے کلام میں اثر نہیں (گنگنانے کی کوشش کرتا ہے)
وقت آتا ہے پھر نہیں آتا!

(کتا بھونکتا ہے)

بیوی۔ (چیختی ہے) لیجیئے ٹامی آگیا! اب اسے لے کر اسپتال سدھاریئے۔

شاعر۔ خیر اسپتال تو مجھے آج جانا ہی تھا۔ ٹامی کو لئے جا رہا ہوں ورنہ اپنے دوست کو لیکر جانا پڑتا۔

بیوی۔ واقعی آپ کا ہر دوست اس قابل ہے کہ اسپتال یا پھر حوالات میں نظر آئے

الکشن کا خبط!

حکومت حاصل کرنے کے لئے پہلے زمانے میں خونریزیاں ہوتیں اور اب اس زمانے میں صرف الکشن ہوتا ہے۔ پہلے تلواریں اٹھتیں اور اب صرف زبانیں چلتی ہیں۔ پہلے سر کاٹے جاتے اور اب صرف پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں۔ لیکن ان تمام سہولتوں کے باوجود جو اب جمہوریت کے نام پر میسر آچکی ہیں مستقبل کے مورخ کے لئے یہ فیصلہ کرنا یقیناً بہت دشوار ہوگا کہ ایک عام شہری کے نقطۂ خیال سے ان دونوں میں سے کون سا طریقۂ کار زیادہ باعزت اور کم پریشان کن تھا۔

ہر الکشن میں امیدوار تو فقیروں کا بھیس بنا کر تماشائے اہل کرم دیکھتا ہے لیکن ووٹر بیچارا اس تماشے کی ہنگامے آرائی سے عاجز آکر اپنے آپ کو قابل رحم سمجھتا ہے۔ ایک ووٹ مانگتا ہے اور دوسرا پناہ ۔ امیدوار تو خیر ایک خود اختیاری فعل ہے لیکن ووٹر ہونا ایک بے اختیاری مظلومیت۔ جس کی تہمت اکثر مرنے کے بعد بھی دور نہیں ہوتی۔ کیونکہ کسی مرحوم کے نام سے ووٹ ڈالنا زندہ دلوں کے حلقوں میں نہ صرف ایک دلچسپ بلکہ نفع بخش تفریح سمجھی جاتی ہے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ ایک لڑاکا اصیل مرغ کی طرح ایک واقعی امیدوار بھی مادر زاد ہوتا ہے۔ وہ صرف الکشن لڑنے کے لئے الکشن لڑتا ہے اور اسے اس کے نتیجے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ میرے قصبے میں ہر پانچویں سال میونسپل بورڈ کا الکشن ہوا کرتا ہے۔ اس میں میرے بہت بے تکلف دوست شرما جی جب سے وہ

امیدوار بننے کے قابل ہوئے، بڑی پابندی سے امیدوار ہوتے ہیں اور ہار جاتے ہیں لیکن مجال ہے جو کبھی ان کے ماتھے پر کوئی شکن بھی آجائے! الکشن کے مہینوں پہلے سے وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے غول کو اپنا جبریہ ورکر بنائے قصبے بھر کا ایک ایک گھر جھنکاتے رہتے اور ایک ایک ووٹر کی ایسی خوشامد کرواتے پھرتے ہیں کہ ان کا ووٹ مانگنے کے بجائے خود اپنی موت مانگنے کا جی چاہنے لگتا ہے لیکن جب نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کی شرما جی کے علاوہ سب کو پہلے ہی سے پوری توقع ہوتی تو شرما جی . . . . پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ فوراً ہی بڑی خندہ پیشانی سے آئندہ الکشن کے لئے تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔

ابھی الکشن میں قریب ایک سال کی مدت باقی تھی۔ محلے میں ایک جگہ موت ہو گئی میں تعزیت کے لئے پہونچا تو دیکھا کہ شرما جی پہلے ہی سے براجمان ہیں۔ حسب دستور لوگ مرحوم کی خوبیوں کا تذکرہ یا مرحوم کے پسماندگان کو صبر کی تلقین کر رہے تھے لیکن شرما جی سامعین کی ایک بڑی ٹولی بنائے آئندہ الکشن میں اپنی کامیابی کے روشن امکانات بیان فرما رہے تھے۔ میت اٹھی تو ہر طرف رونا پیٹنا مچ گیا لیکن شرما جی مرنے والے کے بڑے لڑکے کو سینے سے لگائے صرف یہ تلقین کر رہے تھے "بیٹا جس طرح مرحوم ہمیشہ بلا ناغہ مجھے ووٹ دیتے تم بھی دیتے رہنا تاکہ ان کی روح کو صدمہ نہ پہونچنے پائے۔" قبرستان سے واپسی پر مجمع کے درمیان دفعتاً کسی نے پیچھے سے میرا بازو پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو شرما جی مسکرا رہے تھے۔ میں ان کی حرکتوں کے باعث جو وہ تھوڑی دیر قبل کر چکے تھے ان کی صورت سے بیزار بیٹھا تھا۔ میں نے تلملا کر کہا "دیکھئے شرما جی مجھ سے اس وقت الکشن کی کوئی بات ہرگز نہ کیجیئے گا۔" ہنستے ہوئے بولے "تم پھر وہی

وقت الکشن ہی کا بھوت سوار رہتا ہے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا کہ تمہارے گھر کے قریب جو دو رکشے والے رہتے ہیں ان کے رکشے ابھی سے طے کر لو۔"

اور قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دے سکتا وہ مجمع میں کسی دوسرے شکار پر جھپٹتے ہوئے مجھے یہ بشارت دے گئے "تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے میں کل سویرے ہی تمہارے مکان پر آجاؤں گا۔"

دوسرے دن تین بجے رات سے میرے دروازے کی زنجیر بجنا شروع ہو گئی جب زنجیر کے ساتھ دروازا ٹوٹنے کا اندیشہ ہونے لگا تو میں نے بستر سے اٹھ کر طوعاً و کرہاً دروازا کھولا۔ شرما جی اپنے گرد ایک کمبل لپیٹے فرما رہے تھے "اجی سوتے ہو یا گھوڑے بیچتے ہو۔ کیا سہانا وقت ہے چلو تھوڑی سی چہل قدمی ہو جائے۔" میرے انکار اور ان کے اصرار کی تفصیلات کا تذکرہ لا حاصل ہے۔ قصہ مختصر بستر پہن کر مجبوراً ان کے ساتھ گھر سے باہر نکلا۔ خدا بھلا کرے ایک گشت کرنے والے کانسٹیبل کا، اس نے گلی کی نکڑ ہی پر ہم دونوں کو دھر لیا۔ شرما جی نے کہا "اجی ہم لوگ مارننگ واک پر جا رہے ہیں۔" وہ ہنس کر بولا "اس وقت آدھی رات کو مارننگ واک پر جا رہے ہو تو پھر مارننگ واک کر کے بھی کیوں نہیں سو رہے تھے۔ چلئے میرے ساتھ کوتوالی چلئے۔"

کوتوالی کے برآمدے میں سویرے تک دار وغہ جی کے انتظار میں بیٹھ کر مجھ سے اور شرما جی سے کچھ اس قسم کا مکالمہ ہوا۔

"شرما جی! اب تو خود اپنے آپ پر رحم کیجئے اور آئندہ الکشن لڑنے سے باز آجائیے۔"

"کیوں"؟

"آپ غالباً تین الکشن ہار چکے ہیں۔"

"چار" انھوں نے لقمہ دیا۔

"پھر ان ناکامیابیوں سے آپ پر کیا ظاہر ہوا"

"بہت کچھ"

"کیا؟"

"یہی کہ پہلے الکشن میں میرا پرچہ نامزدگی خارج ہو گیا تھا۔ دوسرے میں پانچ سو ووٹ سے ہارا تھا۔ تیسرے میں قریب ایک ہزار سے"

"اور چوتھے یعنی آخری بار تو آپ کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی تھی؟"

"تو بھئی اس کو میں کیا کروں؟ یہ تو سرکار کا بنایا ہوا قانون ہے۔ البتہ سچ پوچھو تو اس آخری الکشن میں جب میں پندرہ سو ووٹ سے ہارا تھا تو میں قریب قریب چن ہی لیا گیا تھا۔ مجھے خیال تھا کہ میرا انتخابی نشان گھوڑا ہے چنانچہ میں نے لوگوں سے اسی پر نشان لگانے کی فرمائش کی تھی اور ان بیچاروں نے پوری بھی کر دی تھی لیکن نتیجے کے اعلان کے وقت پتا چلا کہ میرا انتخابی نشان گھوڑا نہیں بلکہ گھڑا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرا مخالف گھاس کھا گیا ہے جو میرے گھوڑے کے لئے ووٹ مانگ رہا ہے لیکن وہاں معاملہ بالکل ہی الٹا نکلا۔

"اب ضمانت ضبط ہو جانے کے بعد کون سی عزت افزائی باقی رہ گئی ہے جس کے لئے کسی پاگل کتے نے آپ کو مشورہ دیا ہے کہ آپ آئندہ الکشن لڑیں ضرور۔"

۔ !جی ہوش کے ناخونوں کی دوا کرو ! کیا اپنے مخالفین کو یہ کہنے کا موقع دیدوں کہ ضمانت ضبط ہو جانے کے بعد اکھاڑے سے بھاگ نکلا؟"

اب بھلا ایسے امیدوار کو الکشن لڑنے سے کون روک سکتا تھا۔

شرما جی کے پیچھے کشاں کشاں ایک ووٹر کے مکان پر پہونچا۔ فہرست کی ورق گردانی سے پتہ چلا کہ یہ چھو خاں کا مکان ہے۔ بڑی دیر تک کنڈی کھٹکھٹاتے

ادھر چیختے رہے تب کہیں ایک محترمہ کو غالباً ترس آگیا۔ دروازے کے پاس آکر پوچھا "کون ہے؟" بہت ادب سے عرض کیا گیا "چھوخاں صاحب گھر میں تشریف رکھتے ہیں؟ آرام کر رہے ہوں تو ہم لوگ کسی دوسرے وقت حاضر ہو جائیں ۔؟" نہیں معلوم اس جواب نے کون سا کیمیائی عمل کیا کہ محترمہ آپے سے باہر ہو گئیں "کون چھو ممو؟ وہ کون ہوتا ہے مُوا یہاں تشریف رکھنے اور آرام کرنے والا. پرائی بہو بیٹیوں پر اس طرح اتہام لگاتے شرم نہیں آتی؟ آخر آپ ہیں کون؟" شرماجی کو بالکل نئی سوجھی "ہم لوگ شیر کے نشان کے لئے ووٹ مانگنے آئے ہیں"۔

محترمہ چیخیں "اب قیامت تک اس گھر سے کیا اس پوری گلی سے شیر کے نشان کو ووٹ نہیں مل سکتا"۔

شرماجی خوش خوش آگے بڑھے۔ ان کا انتخابی نشان مرغا تھا۔ بھولا ناتھ جی اپنے دروازے ہی پر مل گئے۔ ان کا پوتا قریب ہی زمین پر پڑا لوٹ رہا تھا شرماجی نے لپک کر پوتے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کی چیخوں کے درمیان بھولا ناتھ جی نے ووٹ دینے کا حلفیہ وعدہ کر لیا۔ شرماجی چلنے لگے تو آخری مرتبہ پھر گھگھیا کر بولے "جی ہاں تو بھولئے گا نہیں میرا چناؤ چنھ مرغا ہے"۔

"مرغا؟" بھولا ناتھ جی بڑی وحشت سے گرجے۔

"کیوں خیریت!" شرماجی نے پوچھا۔

"پھر مجھے معاف کیجئے۔ میں کسی مرغے کو ووٹ دینے سے بالکل ہی مجبور ہوں"۔

"اجی یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ مرغا تو میں ہوں آپ کا پرانا خادم!"

"خادم نادم کچھ نہیں۔ آئے دن کم بخت میرے باغیچے کی کیاریوں کا ستیاناس

کر جاتا ہے ــــ اور آپ جانتے ہیں کہ میں خالص سبزی خور ہوں ورنہ ...."
اور پھر شرما جی کی گود سے اپنے پوتے کو گھسیٹ کر بھولا ناتھ جی مکان کے اندر ہو گئے۔
شرما جی نے بدھو ٹھے میں گھس کر اپنا آخری وار کیا۔ یعنی بڑے زور سے ہانگ لگائی " اجی وہ ناشدنی مرغا جو آپ کی کیاریوں کا ستیاناس کرتا ہے آپ ووٹ کے پرچے پر اُسی کی گردن پر نشان لگا دیجئے گا۔"
اور اپنے خیال میں اس ووٹ کو بھی پکّا کر کے وہ دوسری طرف مڑ گئے ایک گلی میں تھوڑی کھلی جگہ پر بارہ چودہ آدمی بیٹھے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ ہم لوگوں کے گروہ کو دور ہی سے دیکھ کر ان میں سے ایک بڑے مسخرے بولا۔" لو وہ پھر آ گئے! گھر وا دیا چھوڑ دینے والے! ٹیکس معاف کر دینے والے! نالی بنوا دینے والے! بیا گو دینے والے! دماغ خراب کر دینے والے" اور پھر دو تین ایک ساتھ چیخے " بھاگو! بھاگو" اور سب لوگ ایک دم سے سر پر پیر رکھ کر بھاگے اور آس پاس کے مکانوں کے دروازے تڑ پڑ بند ہو گئے۔ چھت پر سے کوئی چیخا " چھوڑ دو! کتے چھوڑ دو ان پر!" اور پھر کئی خوفناک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ غالباً یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ ہم لوگوں کے گروہ کا ہر فرد اپنی زندگی کی سب سے تیز دوڑ، بڑی سراسیمگی سے بھاگ رہا تھا۔
ابھی ابھی الکشن کے نتیجے کا اعلان ہوا ہے۔ محلے میں ہر طرف مرغے بول رہے ہیں اور ایک بہت بڑا جلوس

سر کو جھکا دے دم کو اٹھا دے
بول مرے مرغے! ککڑوں کو!

کے والہانہ نعرے لگاتا ہوا بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ غالباً شرما جی کامیاب ہو گئے ہیں!

زُود پشیماں

"بند کرو! بند کرو اس چیں چیں، پیں پیں، گھِس گھِس پھٹ پھٹ کو! یہ شریفوں کا محلہ ہے یا چانڈو خانہ؟ اس زور سے پٹخوں گا تمہارے اس ریڈیو کی دُم کو کہ وہ گھن چکر بن کر رہ جائے گا۔ تمہیں مرغے سے ایسا ہوائی جہاز بنا کر چھوڑ دوں گا کہ تمہاری داستاں بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔"

بھیگی ہوئی رات کی سحر کن خاموشی میں رام ناتھ کے ریڈیو پر غالب کی غزل ،نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے، اپنے روح پرور ترنم سے فضا میں رومان انگیز کیفیت کے ڈونگرے برسا رہی تھی۔ دفعتاً جمبو چاچا کی یہ بھاری بھرکم گرجدار ڈپٹ اس طرح گونجی جیسے کئی توپیں ایک ساتھ داغ دی گئی ہوں۔ رام ناتھ جیسے سیدھے سادے اور بھولے آدمی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے اس ملامت ناگہانی کو کوئی بلائے آسمانی سمجھا اور اپنے کانپتے ہاتھوں سے ریڈیو فوراً بند کرکے اپنے بستر میں گھس گیا۔

چچا چمپت سنگھ نے جو بعد میں کثرت استعمال سے صرف جمبو چاچا رہ گئے تھے محلے میں اپنی آمد کے پہلے ہی دن یہ دوسرا کرتب دکھلایا تھا۔ پہلا کرتب وہ آتے ہی آتے دکھلا چکے تھے۔ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ تھانیداری سے پنشن لے کر، وہ بیوی بچوں کے ساتھ لدے پھندے کسی بلائے بے درماں کی طرح اچانک وارد بلکہ حملہ آور ہوئے تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے آبائی مکان میں، جس میں ایک

مدت سے ایک کرائے دار رہ رہا تھا بے ساختہ گھس پڑے۔ بڑا غل غپاڑہ مچا اور بہت ممکن تھا کہ کوئی سنگین فوجداری ہو جاتی لیکن بالآخر محلے کے چند بھلے آدمیوں نے درمیان میں پڑ کر تصفیہ کرا دیا۔ چھبو چا تو اپنے آگے کسی کی ماننے والے تھے نہیں لہٰذا مجبوراً بیچارے کرائے دار ہی کو سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کر لیا گیا کہ وہ گھسو میاں کے مکان کے ایک خالی حصے میں منتقل ہو جائے۔

یہ معاملہ چھبو چا کے حسب منشا طے ہو گیا تو اس کے بارے میں انھوں نے متعلقہ لوگوں کا شکریہ ایک عجیب انداز سے ادا کیا "یہاں محلے والوں کے پاس فالتو وقت کی کوئی کمی نہیں ہے جب سے آیا ہوں تماش بینوں کا ایک تانتا سا بندھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں انسان نہیں بلکہ کا کچی ہوز سے بھاگ نکلنے والا کوئی بن مانس ہوں۔ میرا گھر اچھا بھلا چڑیا خانہ بن کر رہ گیا ہے۔ جس کو دیکھو چلا آ رہا ہے آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے ہوئے۔" ایک احساس خجالت کے ساتھ محلے والوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ فوراً ان کے مکان سے باہر نکل گئے

رات کو رام ناتھ کے ریڈیو کا واقعہ پیش آیا۔ دوسرے روز سویرے چائے والے کی دوکان پر چھبو چا نتھوں خاں سے جو محلے بھر میں سب سے زیادہ نک چڑھے سمجھے جاتے تھے، نہیں معلوم کس بات پر بگڑ پڑے اور خوب چیخے چلائے۔ دوپہر تک بھوندو پنساری پر خفا ہو کر آستینیں چڑھالیں اور شام کو رامو مہتر پر باقاعدہ لاٹھی لے کر دوڑ ہی تو پڑے۔ اور وہ بیچارا جب بھاگ کر بسنت لال کی ڈیوڑھی میں گھس گیا تو انھوں نے دروازے پر رکھے ہوئے ان کے دو پھولوں کے گملے توڑ ڈالے۔

ہمارا محلہ جو قصبے کے ایک کنارے پر اس کے شور و شغب سے دور تھا، بہت ہی پر امن سمجھا جاتا۔ جہاں ہفتوں، مہینوں کیا برسوں کوئی جھگڑا یا ہنگامہ

نہ ہوتا، وہاں چھپو چا کے ہاتھوں چند گھنٹوں کے اندر جو اتنے بہت سے انہوں نے
واقعات ہوگئے تو ایک کھلبلی اور ہلچل سی مچ گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی چھوٹے
سے تالاب کے ساکن پانی میں کسی شریر لڑکے نے ایک دم سے یکے بعد دیگرے
کئی پہاڑ پھینک دیئے ہوں۔ ہر طرف چھپو چا ہی کا ذکر خیر تھا۔ "یہ آدمی ہیں اکڑ
بگھا ہے"۔ "اس ہلاکو کے ساتھ بسر کیسے ہوگی؟"۔ "یہ بزبان ہی ہیں خطرناک
بھی ہے"۔ "یہ دجال قرب قیامت کی نشانی ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔

چھپو چا ہر روز کوئی نیا شگوفہ ضرور چھوڑتے گویا کہ اس کے بغیر ان کی زندگی
بے مقصد رہ جاتی ــــ اور محلے والے بھی اس کے کچھ اس قدر عادی ہوگئے تھے
کہ اگر کسی روز اتفاق سے وہ بھول بھی جاتے تو محلے کے بعض منچلے اَدبدا کر از خود
کچھ بہانے فراہم کر دیتے کیونکہ انھیں بھی اب ان کے گرجنے اور برسنے پر غصے کے
بجائے لطف آنے لگا تھا۔ سارے محلے نے متحد ہو کر ان کے خلاف ایک سرد
جنگ شروع کر رکھی تھی۔ کوئی شخص ان سے بات کرنا تو در کنار ان کی صورت
تک دیکھنے کا روادار نہ ہوتا۔ ان کے گھر کے سامنے کی گلی خلاف معمول سنسان
نظر آتی۔ مہتر ان کے دروازے پر جھاڑو نہ دیتا۔ پنساری نے انھیں سودا دینے
سے انکار کر دیا۔ بنوں خاں نے ان کے کرائے دار کو ازسرِ نو بھڑکا کر ان پر عدالت
میں نالش کرا دی تھی۔ قدرت اللہ نے جو رام ناتھ کے لنگوٹیا یار اور پہلے ریڈیو
سے انتہائی بیزار تھے، ایک نیا ریڈیو خریدا تھا اور ہر رات کو بلا ناغہ اس کھڑکی
میں جو چھپو چا کے مکان سے متصل تھی، سب سے اونچے سروں میں بجایا کرتے اور
اور اس پر جب چھپو چا تڑپتے اور بپھرتے تو سارے محلے میں قہقہوں کی بے شمار
گھنٹیاں سی بجنے لگتیں۔

کئی ہفتوں بعد ایک روز جب چھپو چا بازار سے واپس آرہے تھے تو میں نے

دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب اس عنوان کی تھی "دشمن کو دوست بنانے کے نسخے" اور اس کے بعد کئی روز تک وہ اپنے مکان کے صحن میں اکیلے بیٹھے اسے پڑھتے دیکھے گئے اور پھر ایک دم سے ایک عجیب انقلاب آگیا اور جمبو چا کی بالکل ہی کایا پلٹ ہوگئی۔ چند ہی دنوں میں جمبو چا، رام ناتھ اور قدرت اللہ کے درمیان نہ صرف صفائی بلکہ ان کی آپس میں دانت کاٹی دوستی ہوگئی۔ تینوں شام کو بسنت لال کی ڈیوڑھی میں جمع ہوتے اور گھنٹوں شطرنج کھیلتے۔ بھوندو پنساری پھسل کر نالی میں گر پڑا تو کسی بورے کی طرح جمبو چا ہی نے اسے رکشے پر لادا اور اسپتال دکھانے لے گئے۔ بنّوں خاں کی لڑکی کی شادی ہوئی تو بن بلائے شادی کے انتظامات میں جمبو چا ہی سب سے پیش پیش نظر آئے۔ رامو مہتر کو انھوں نے اپنے یونیفارم کا ایک پرانا گرم کوٹ بخش دیا۔ ہر محلے والے سے وہ انتہائی اخلاق اور محبت سے ملنے لگے اور یقین ہی نہ آتا کہ یہ وہی جمبو چا ہیں جنھوں نے کبھی محلے میں قدم رکھتے ہی اس کی پرسکون زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ محلے کے دانشوروں کا پختہ یقین تھا کہ جمبو چا بیچارے کسی آسیب کے ستائے ہوئے تھے ورنہ ان کا جیسا معقول انسان وہ حرکتیں کر ہی نہیں سکتا تھا جو انھوں نے آتے ہی کر ڈالی تھیں

بہت جلد جمبو چا کا گھر ایک فلاحی دوستاں کلب بن کر رہ گیا۔ ہر وقت ملنے والوں کا ایک تانتا سا بندھا رہتا اور جمبو چا بھی ہر ایک کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ کسی کے لئے تخت پر دری بچھا رہے ہیں تو کسی کے لئے کرسی یا مونڈھا اٹھائے لا رہے ہیں۔ کسی کو چائے پلا رہے ہیں تو کسی کو شربت۔ محلے میں کسی کے پھانس بھی لگتی تو جمبو چا بے چین ہو جاتے۔ کبھی دیکھو تو کسی کی بیمار بھینس کے ساتھ مویشی اسپتال جا رہے ہیں۔ کبھی کسی کی کھوئی ہوئی مرغی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور کبھی نالے کے کیچڑ سے لت پت کسی لڑکے کو

پکڑ کر اس کے والدین کے سپرد کرنے جا رہے ہیں۔ محلے کے کاموں کی وجہ سے ان کا ایک پیر گھر میں رہتا تو دوسرا بازار کچہری یا اسپتال میں۔ جب دیکھو کسی دوسرے کے غم میں پریشان اور سرگرداں نظر آ رہے ہیں کہیں شادی ہے تو چاول اور شکر کی تلاش میں دہی کوڑی کھیپ دوڑ رہے ہیں۔ اور کہیں موت ہو گئی ہے تو کفن لانے کی ذمہ داری انھیں کے سپرد ہے۔

چمپو چا کے گھر کی چیزیں تمام محلے کے استعمال کے لئے وقف ہو چکی تھیں۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہوتی بلا تکلف مانگ لے جاتا۔ ان کی الماریوں میں رکھی ہوئی کتابیں سارے محلے میں تقسیم ہو چکی تھیں۔ کسی کی جلد پھٹ کر واپس آتی کسی کے کچھ صفحے کوئی چنو منو پھاڑ ڈالتے اور کوئی صفحہ ہستی ہی سے معدوم ہو جاتی لیکن چمپو چا کے ماتھے پر شکن نہ آتی۔ شکور کے یہاں شادی میں ان کے ریشمی قالین پر حقے کی ایک بھری چلم اوندھ پڑی اور اس میں ایک بڑی سینی کے برابر سوراخ ہو گیا لیکن وہ کچھ کہنے کے بجائے خود شرما کر رہ گئے۔ ان کے بڑی محنت سے لگائے ہوئے پھولوں کے پودے نرائن کی بکریاں چر گئیں لیکن خفا ہونے کے بجائے چمپو چا اس بکری کی خیریت ہی پوچھتے رہے جو ہنکائے جانے پر کانٹے دار تار میں الجھ گئی تھی۔ گھاسڑ داس کے یہاں سے ان کی نئی مسہری جھولا بن کر واپس آئی لیکن وہ اپنا سر کھجلا کر دم بخود ہی رہ گئے۔ غرض کہ چمپو چا کے وسیع اخلاق سے ہر شخص اپنی بساط بھر فائدہ اٹھا رہا تھا اور وہ ہر طرح کا نقصان برداشت کرتے لیکن پہلے سے بھی زیادہ رشتہ خلطی ہوتے جاتے۔ لوگ کہتے چمپو چا کے بھیس میں کوئی دیوتا یا فرشتہ محلے میں آ گیا ہے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ ایک روز سنا کہ چمپو چا کو نمونیہ ہو گیا ہے۔ میں دیکھنے گیا تو ایک چارپائی پر کمبل اوڑھے کراہ رہے تھے۔ پاس ہی چچی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ کہا اپنی چچی سے پوچھو جنھوں نے اس حال تک پہونچایا ہے اور جنھیں میرے سور گباش ہو جانے تک چین ہی نہ آئے گا۔" میں نے تعجب سے چچی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے آنچل سے اپنی آنکھیں پوچھ کر خاموش رہیں۔

کچھ دیر بعد چچو چچا خود بولے" پنشن لے کر آیا تو میں چاہتا کہ زندگی کے یہ آخری دن محلے والوں سے الگ تھلگ، بالکل سکون اور عافیت سے کٹیں۔ لیکن تمہاری چچی اٹھتے بیٹھتے میرا ناک میں دم کئے رہتیں کہ سب سے ملو جلو، ہر ایک کے دل میں جگہ بناؤ، ہر دل عزیز بنو، چنانچہ جب خود گھر کے اندر میری عافیت خطرے میں پڑ گئی تو میں نے بھی سوچا کہ چلو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ جھوٹے کو گھر ہی تک پہونچاؤں۔" وہ سانس لینے کے لئے رک گئے۔

چند لمحوں بعد ایک ٹھنڈی سانس لے کر پھر گویا ہوئے:" اور تم نے دیکھا کہ ہر دل عزیز بننے کی کوشش میں میرا کیا انجام ہوا۔ گھر کا سارا سامان محلے والوں کی نذر ہو گیا۔ کوئی بھی حیثیت کی چیز باقی نہیں رہی۔ لوگ جوتے اور کپڑے تک مانگ لے گئے۔ آدھے سے زیادہ پراویڈنٹ فنڈ خاطر تواضع میں اڑ گیا۔ سکون کا ایک لمحہ بھی عنقا ہو گیا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی اپنا دکھڑا لئے چلا آ رہا ہے۔ دروازے کی زنجیر بج رہی ہے اور "دارو غہ صاحب! دروغہ صاحب!" کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ یقین کرنا ایک سال میں دروازے کی دو زنجیریں بدلوا چکا ہوں اور بیٹھکے کی ساری کرسیاں اور مونڈھے ٹوٹ چکے ہیں۔ ایک منٹ کے لئے بھی چاہوں کہ اپنا کوئی کام دیکھ لوں تو نا ممکن! کہیں شادی ہے تو سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے ناچوں اور کہیں موت ہو جائے تو اپنے کپڑے پھاڑ کر چیختا پھروں۔ تین روز ہوئے نتھو مر گیا تو آدھی رات کو برستے پانی میں اس کا جنازہ لے کر قبرستان جانا پڑا۔ اب اسی خمیازہ میں نمونیہ میں مبتلا پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔ میں باز آیا ایسی ہر دل عزیزی

ہے۔ بخشو بلی جو ہالنڈ ورہ ہی بھلا۔"

مجھے چیبو چا کی مکمل صحتیابی کا یقین اس وقت ہوا جب ایک ہفتہ کے بعد ایک روز رات کے سناٹے میں ان کی کڑک دار آواز پھر گونجی۔

"بند کرو! بند کرو! اس جیں جیں پیں پیں گھس گھس پھٹ پھٹ کو! یہ شریفوں کا محلہ ہے یا چانڈو خانہ۔ اس زور سے ٹھیکوں گا تمہارے اس ریڈیو کی دم کو کہ وہ گھس حچر بن کر رہ جائے گا اور تمہیں مرغے سے ایسا ہوائی جہاز بنا کر چھوڑدوں گا کہ تمہاری داستاں بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔"

---*---

غالب اور زاہد

جب سے شاعر کی اس شوریدہ بختی کے باعث کہ ع

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے

وہ حضرت زاہد کا، "ہاں نہ مان میں تیرا مہمان"، قسم کا ہمسایہ بن بیٹھا ہے، دونوں ہی اپنے آئے دن کی غل فش اور تو، تو، میں، میں کے باعث پر امن شہریوں کے لئے قرب قیامت کی نشانیاں بن کر رہ گئے ہیں۔

بہتوں نے حضرت زاہد کی منت سماجت کی کہ یہ شاعر خانہ خراب، عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا ہے۔ کوچہ دلدار میں برسوں سے پاسبان اس کی مرمت کر رہا ہے لیکن اس نگے کو درست نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ آپ اس کو ساتھ لئے بغیر اکیلے ہی جنت چلے جائیے گا تو آپ پر کون سی ایسی آفت آجائے گی۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑیئے اور یہ روسیاہ بدزبان ہونے کے علاوہ ہتھ چھوٹ بھی ہے لہٰذا اس کی عاقبت سدھارنے کی کوشش میں آپ اپنی عافیت کو کیوں خطرہ میں ڈالتے ہیں ؎

رندان در میکدہ گستاخ ہیں زاہد

زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

لیکن بھلا حضرت زاہد کسی کی کب سننے والے تھے۔ بحث و تکرار اور فتنہ و فساد ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا ــــ وہ "جیو اور جینے دو" کے اصول سے سخت متنفر اور "لڑو اور لڑاؤ" کے اصول پر شدت سے کاربند تھے۔ نکتہ چینی، عیب جوئی اور لعنت ملامت کرنا، اور وہ بھی اس انداز سے کہ کسی دوسرے کی اصلاح تو جائے چولہے میں البتہ ان کی ہمہ دانی کا ڈنکا خوب پٹ جائے، وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے، لہٰذا اس سے وہ کسی قیمت پر دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔

دوسری طرف کچھ لوگوں نے شاعری کی ٹھوڑی میں ہاتھ دیا کہ میاں عاشق جانباز تجھے لڑنے جھگڑنے کے لئے تیرے معشوق رقیب اور دربان ہی کیا کم ہیں، جو حضرت زاہد کی پگڑی اچھالنے پر تلا بیٹھا ہے۔ ان کا لہجہ لاکھ تند اور ترش سہی، عمر میں بھی تو تیرے باپ سے کم نہیں ہیں۔ تو کیوں ان کی بات کا برا مانتا ہے۔ اور ان کو موقع بے موقع چھیڑتا اور منہ چڑھاتا ہے سنی ان سنی کر جا۔ بزرگوں سے زبان لڑانا ٹھیک نہیں ؎

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

لیکن شاعر نے بھی حضرت زاہد ہی کا جیسا خمیر اور مزاج پایا تھا۔ وہ کسی کی سنتا تو آج اس حالت کو کیوں پہونچتا حضرت زاہد اگر اسے صراط مستقیم پر لانے کی فکر میں تھے تو وہ بھی بقول خود انھیں زاہد خشک سے انسان بنا دینے

پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ غرض کہ سمجھانے بجھانے والوں نے جب دیکھا کہ ع
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔ کا مضمون ہے تو تھک
ہار کے بیٹھ رہے۔ حضرت زاہد اور شاعر جب کبھی مل بیٹھتے ہیں دونوں میں دو
دو چونچیں ضرور ہو جاتی ہیں اور تماشا دیکھنے والے انھیں روکنے کے بجائے اور بھی
سان پہ چڑھا دیتے ہیں۔

شاعر نے حضرت زاہد کے خلاف کچھ عجیب و غریب ہوائیاں اڑا رکھی ہیں
مثلاً وہ دختِ رز کے پرانے شیدائی ہیں۔ حسن پرستی میں وہ بڑے بڑے بوالہوس
کے بھی کان کاٹتے ہیں۔ مکاری اور ریاکاری ان کا اوڑھنا اور بچھونا اور ٹٹی کی
آڑ میں شکار کھیلنا ان کا محبوب ترین شغل ہے۔ میخانے میں نظریں بچا کر جاتے ہوئے
انھیں اکثر دیکھا گیا ہے اور حسینوں کو گھورنے میں انھیں کوئی باک نہیں ہے۔ منافع
خوری میں وہ داورِ محشر کو بھی معاف کرنے کے لئے تیار۔ وغیرہ وغیرہ ۔
بسکہ ہیں در پردہ مصروفِ سیہ کاری تمام ۔ آستر ہے خرقۂ زہاد کا صوفِ مداد

نہیں معلوم ان افواہوں میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔ بہر کیف خلوت
میں حضرت زاہد کچھ بھی ہوں اور ان کی خانگی زندگی کیسی بھی ہو وہ صورت شکل
اور وضع قطع سے بڑے پہونچے ہوئے بزرگ اور اللہ والے نظر آتے ہیں بلکہ
اکثر ان کو دیکھ کر یہ شبہ گذرتا ہے کہ شاید غلطی سے راستہ بھول کر کوئی فرشتہ آسمان
سے زمین پر اتر آیا ہے البتہ ان کا طرزِ تخاطب دیکھ کر یہ تعجب ضرور ہوتا ہے کہ
اس جنت آشیانی کے منہ سے جنت کے پھول برسنے کے بجائے جہنم کی چنگاریاں
کیوں پھوٹتی رہتی ہیں۔

اپنی تقدس مآبی میں چار چاند لگانے کے لئے حضرت زاہد نے اپنے چہرے
پر وہ خشکی بلکہ کرختگی طاری کر رکھی ہے کہ جیسے دیکھ کر مئی کی تپتی اور جھلستی ہوئی

دوپہر بھی نشاط انگیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ قہر زدہ آنکھوں سے گنا ہوں کو ڈھونڈھتے ہوئے سڑک پر سے گذرتے ہیں تو کار زار حشر کا ایک چلتا پھرتا اشتہار معلوم ہوتے ہیں حسن رہ گذر دیکھ کر فوراً کچھ بڑبڑاتے ہوئے منہ پھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر شومیٔ قسمت سے دوسری طرف بھی کوئی کفر ظہور پذیر ہو جاتا ہے تو انتہائی سراسیمگی کے عالم میں کسی تیسری جانب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا نغمہ ان کے کانوں میں جا گھستا ہے تو کچھ ایسا منہ بناتے ہیں جیسے انھیں چھینک آنے والی ہو لیکن آنہ پاتی ہو۔

عاشقی اور رندی تو کوسوں دور رہی وہ شاعری۔ ادب۔ نغمہ۔ موسیقی مصوری آرٹ غرض کہ ہر قسم کے جمالیاتی ذوق اور فنون لطیفہ کو مخرب اخلاق اور حیا سوز سمجھتے ہیں۔ انھیں ہر طرح کے حسن اور کیف میں جس سے آنکھوں میں نور، دل میں سرور اور زندگی میں شعور پیدا ہو سکے اپنی پارسائی کو متزلزل کر دینے کی ایک منظم سازش نظر آتی ہے۔ ان کی رائے میں زندگی ایک مرگ مسلسل ہے اور بس۔ اور اس کو مر مر کر جینا ہی نجات کا واحد ذریعہ ہے، اور اس کو شگفتہ۔ خوشگوار اور قابل قبول بنانے کی ہر کوشش ایک شدید نافرمانی سے کم نہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کو جتنی ترقی کرنا تھی وہ اب سے صدیوں پہلے کر چکا ہے۔ اس کے بعد سے اس نے علم و عمل کے جتنے بھی معرکے سر کئے ہیں اور سائنس کی مدد سے قدرت پر جو بھی فتوحات حاصل کی ہیں وہ سب ہیچ اور بیکار محض ہیں۔ اب وہ صرف قیامت کے انتظار میں ترقی معکوس کر رہا ہے۔ انھیں ہر نئی چیز میں ندرت کے بجائے عبرت نظر آتی ہے انسانیت کے وسیع اور ناقابل تقسیم تصور سے وہ یکسر بیگانہ ہیں۔ حب انسان ذوق حق۔ جہد زندگی اور خدمت خلق کے ولولوں کی تابناکی ان کے دل و دماغ کے ہر نیم تاریک گوشوں تک کبھی پہونچ ہی نہیں سکی۔

اپنی سمجھ کے مطابق حضرت زاہد محض چند معمولات پر سختی سے کاربند رہنے اور چند مخصوص عادات و خصائل کو اختیار کر لینے کے انعام میں نہ صرف جنت کو اپنی میراث قرار دیتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو اس منصب پر بھی فائز سمجھتے ہیں کہ جس شخص کو چاہیں کانجی ہوس میں جانوروں کی طرح ا جہنم میں بند کرا دیں۔ جہنم کے پاسپورٹ فتوؤں کی صورت میں ہر وقت ان کی جیب ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ شاعر اس کو زہد تقویٰ نہیں بلکہ کھلی ہوئی سوداگری سمجھتا ہے لہٰذا منہ چڑھا کر کہتا ہے ؎

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

یوں تو حضرت زاہد اور شاعر کے درمیان دنیا کا ہر مسئلہ متنازعہ ہے لیکن سب سے بنیادی اختلاف یہ ہے کہ حضرت زاہد زندگی کا حاصل جنت اور شاعر زندگی کا حاصل خود زندگی کو سمجھتا ہے۔ حضرت زاہد کے منہ سے جنت کا دلفریب جغرافیہ سن کر مرعوب ہونے کے بجائے وہ الٹا خود ان کا مذاق اڑاتا ہے ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

اور پھر اپنے معنی خیز تبسم کے ساتھ جب عقلِ کل بن کر یہ کہتا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

تو بیچارے زاہد کو اپنے ایمان کے ہوائی قلعے کی بنیادیں تک ہلتی محسوس ہوتی ہیں۔ حضرت زاہد اپنی ریاضت کا حاصل جنت سمجھتے ہیں لیکن شاعر کمبخت صرف اسے اپنی میراث اور وہاں بلا ٹکٹ پہونچ جانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے بلکہ انکی ریاضت کو ان کی حماقت پر محمول کرتا ہے ؎

چاہے گر جنت، جز آدم وارثِ آدم نہیں
شوخیٔ ایمانِ زاہد سستیٔ تدبیر ہے

حضرت زاہد کام و دہن کی لذتوں کے پرانے رسیا ہیں لہٰذا جنت کی نعمتوں کے سلسلے میں شہد کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں۔ شاعر جواب میں انھیں بوتل دکھا کر شراب پینے کی دعوت دیتا ہے اور اس غیر متوقع بدتمیزی پر جب وہ رسیاں تڑانے لگتے ہیں تو یہ کہہ کر گویا بارود میں چنگاری ڈال دیتا ہے۔ ؎

کیوں رد قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

حضرت زاہد شاعر کو حرص و ہوا سے کنارہ کش ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں شاعر جلبلا کر جواب دیتا ہے کہ کبھی آپ نے خود اپنی حرص و ہوا بھی ملاحظہ کی؟ آپ کے زہد میں خلوص نیت اور ذوق بندگی کہاں؟ آپ تو حور و قصور اور شراب طہور کی لالچ میں یہ سب ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں۔ اور پھر حضرت زاہد کی ساری آرزوؤں پر پانی پھیر دینے کی غرض سے بزعم خود فرمان صادر کرتا ہے۔

؎ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

حضرت زاہد کہتے ہیں کہ اس دنیا کی عارضی لذتیں اپنے اوپر حرام کر لینے کی تلافی مرنے کے بعد جنت کی دوامی لذتوں سے کی جانے والی ہے۔ شاعر جو نو نقد کا قائل ہے نہ کہ تیرہ ادھار کا جواب دیتا ہے کہ یہ سودا بہت گراں ہے

؎ دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے !!!

اور پھر حضرت زاہد کو سب سے بڑی کوفت اس وقت ہوتی ہے جب ان کی گھنٹوں کی بحث و تکرار اور قیل و قال کو شاعر اپنے صرف ایک غیر سنجیدہ جواب سے چٹکیوں میں اڑا دیتا ہے۔ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
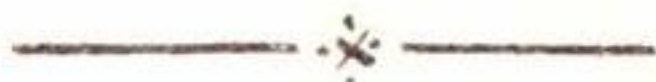
بھوپوچا

میں نے اپنے بچپن میں بھوپندر ناتھ بھاشکر کو ٹھیلہ لیے اور چنا جور گرم کے انداز پر آوازیں لگاتے اپنی کچھ مخصوص دوائیں مثلاً ہڑ کا پانی۔ جل زیرہ۔ ڈکار والے لڈو۔ ہاضمے کا چورن۔ بچوں کا لال شربت وغیرہ وغیرہ بیچتے دیکھا تھا۔ ان کی آوازیں کچھ ایسی بلند کرخت اور عجیب و غریب اتار چڑھاؤ کی واقع ہوئی تھی کہ جب وہ صدا لگاتے تو معلوم ہوتا جیسے کسی بھوپو میں پٹاخے بھر کر داغے جا رہے ہوں۔ محلے کے لوگ اکثر تفریحاً انھیں بھوپو بھاشکر کہہ کر پکارتے اور لڑکے لال شربت کی لالچ میں انھیں بھوپندر چچا کہتے کہتے بھوپو چا کہنے لگے تھے۔ اکثر جب بھوپو چا اپنی موج میں ہوتے تو بعض ان بچوں کو جو ان کے مستقل گاہک تھے وہ لال شربت کی چند بوندیں ان کی ہتھیلیوں پر ٹپکا کر مفت بھی چٹا دیتے۔ اور بعض بعض پر ان کی یہ فیاضی ان کو بہت گراں ثابت ہوتی۔ اس سے محروم بچے تھوڑی دیر ان کے گرد گرد گھڑانے کے بعد "بھوپو چا مردہ باد" کا نعرہ بلند کرتے۔ اس کے جواب میں شربت چاٹے ہوئے بچے "بھوپو چا زندہ باد" پر چیخ کر اپنا آئندہ شربت چاٹنے کا حق محفوظ کرانے کی کوشش کرتے۔ یہ نعرہ بازی بہت جلد جنگل کی آگ ثابت ہوتی اور بچوں کا ایک جم غفیر بھوپو چا کے ٹھیلے کے گرد جمع ہو کر "بھوپو چا مردہ باد" اور بھوپا چا زندہ باد" کے نعرے لگانے لگتا۔ زندہ باد کے نعرے مردہ باد کے نعروں سے کچھ دبتے سنائی پڑتے تو بھوپو چا خود بھی ان میں شریک

ہو جاتے۔ ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ بھوپو چا کی آنکھ بچا کر کوئی لڑکا ڈکار والے لڈو یا ہاضمے کے چورن کی پڑیا لے کر بھاگا۔ بھوپو چا نے اس کا پیچھا کیا لڑکا کسی گھر میں گھس گیا اور بھوپو چا لوٹ کر آئے تو انھیں اپنا ٹھیلہ صاف ملا

اور پھر جب محلے کے لڑکوں کے گلے اور معدے زیادہ جواب دینے لگے اور ان کی نعرہ بازیاں اور دست درازیاں ناقابل برداشت ہو گئیں تو محلے کے چند لٹھ باز بزرگوں نے بھوپو چا کے ٹھیلے کا محلے میں آنا ممنوع قرار دے دیا۔ ایک آدھ سال بعد میں نے دیکھا کہ بھوپو چا نے بازار میں ایک دواخانہ کھول دیا اور پھر کچھ عرصے کے بعد اسی دواخانے پر بہت سی دوسری مہلک بیماریوں کے اشتہاروں کے ساتھ ایک سائن بورڈ "راج وید بھوپندر ناتھ بھاشکر ماہر امراض خصوصی" کا بھی لگ گیا۔ پھر ایک روز میں نے دیکھا کہ بھوپو چا ایک لکڑی کی ٹال پر بیٹھے ہوئے لکڑیاں بیچ رہے ہیں۔ چند مہینوں بعد وہ مزدوروں سے سڑک کٹاتے ہوئے ملتے دریافت کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ میونسپل بورڈ کے ٹھیکے دار ہو گئے ہیں اور خالی وقت میں کھانے کی تمباکو بھی بناتے ہیں۔ اس کے بعد تین چار سال کے لئے بھوپو چا شہر سے باہر چلے گئے اور بقول خود اس عرصہ میں نہ صرف انھوں نے ساری دنیا کی سیر یا تراکر ڈالی بلکہ ہر دیکھنے والی چیز دیکھ اور ہر سیکھنے والی بات سیکھ ڈالی۔ لوٹ کر آئے تو ایک آٹا چکی پر کام کرتے دکھائی پڑے۔ بعد میں سنا کہ چکی کے مستری بھی ہو گئے تھے۔ چکی کچھ غیرت دار واقع ہوئی تھی لہٰذا ان کی پہلی ہی مرمت کی تاب نہ لا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد چند دنوں کے لئے ایک گھڑی ساز کی دوکان پر کچھ کام کرتے دکھائی پڑے۔ پھر بھوپو چا اور گھڑی ساز کے درمیان کسی قسم کا کوئی مقدمہ چلنے لگا۔ مقدمہ تو جلد ہی ختم ہو گیا لیکن بھوپو چا کو کچہری کی ہوا کچھ ایسی راس آئی کہ وہ اس کا ایک مستقل جزو

بن کر رہ گئے۔ پھر وہ مختلف مقدمات میں موقع کے خاص گواہ کی حیثیت سے پیش ہونے لگے اور نہ صرف وکیلوں کو مقدمات سمجھانے لگے بلکہ ان کے کانوں کے قریب اپنا منہ لے جا کر اپنا "حق" بھی مانگنے لگے اور پھر وہ ایک بیوہ سٹھانی کے مختار عام ہو گئے اور چند سال بعد جب سٹھانی مریں تو دنیا کو معلوم ہوا کہ ان کے مکانوں۔ دوکانوں اور باغوں کا ہبہ نامہ بھی وہ پہلے سے لکھائے بیٹھے تھے۔

کسب معاش کی کشمکش سے آزاد ہو کر انھوں نے اپنے پچھلے مشوں اور تجربوں کی روشنی میں بغیر کوئی معاوضہ لئے خلق خدا کی خدمت کرنا اپنا شعار بنا لیا۔ وہ بیک وقت حکیم۔ وکیل۔ مستری۔ نجومی۔ کیمیاگر۔ درزی۔ معمار۔ بڑھئی۔ فنکار۔ باغبان۔ موسیقار۔ تاجر۔ لیڈر۔ خدائی فوجدار غرضکہ ہر فن مولا تھے اور اپنے غیر طلبیدہ مشوروں سے ہر کس و ناکس کو مستفید کرنا اپنا پیدائشی فرض سمجھتے۔

سڑک پر جاتے ہوئے انھیں کوئی سفید بالوں والا آشنا مل جاتا تو اسے خضاب کا نسخہ بتائے ہوئے بغیر آگے بڑھ جانا وہ گناہ کبیرہ سمجھتے " دیکھئے پہلے بالوں میں کڑوا تیل ڈلئے پھر جب نرم ہو جائیں تو جوتے کی کوئی اچھی پالش لے کر کسی پرانے برش سے بالوں میں خوب کس کر لگا ڈلئے۔ بال خشک ہو جائیں تو بیشک ملکر نہا ڈلئے ایک بال بھی سفید باقی نہیں رہے گا. تین چار دفعہ لگانے کے بعد بال نکلنا بھی بند ہو جائیں گے۔"

کسی شخص سے پوچھا "کیا کر رہے ہو؟" اس نے کہا " سر مہ، مسّی بیچ رہا ہوں۔" اس کو فوراً مشورہ دیا " یہ کس حماقت میں مبتلا ہو۔ دیکھو تم بکریاں پالو۔ سال بھر میں ایک بکری سے چار بکریاں ہو جاتی ہیں اور پھر دودھ کھاتے ہیں اور اگر تمہاری قسمت سے بکری مرجائے تو اس کی قیمت سے زیادہ کی اس کی کھال بک جاتی ہے۔ ہڈی والے سے طے کر لو تو ہڈیوں کے بھی مناسب دام مل جاتے ہیں۔"

ایک صاحب ایک ٹوٹا ہوا آئینہ لئے جا رہے تھے۔ پوچھا "کیا ہوا؟" بتایا "بندر نے توڑ ڈالا۔" بھوپوجا نے فوراً نہ صرف آئینہ جوڑنے کا کوئی مجرب نسخہ بتا دیا بلکہ بندر پکڑنے کی بھی ایک نئی فی البدیہہ ایسی ترکیب سمجھا دی کہ جس میں بندر پکڑ لینے والا امکان کم سے کم اور اس کے کاٹ کھانے کا اندیشہ زیادہ سے زیادہ تھا" بندر کے ایک چھوٹے بچے کو کسی ایسے کمرہ میں بند کر دو جس میں سلاخیں لگی ہوئی ہوں۔ اس کو دیکھ کر جب بہت سے بندر جمع ہو جائیں تو دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھلا چھوڑ دو۔ سب بندر بلا تکلف کمرے میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر کیا ہے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دو پورے ایک زندہ عجائب خانے کے مالک بن جاؤ گے۔"

اُن کے ملنے والوں کے بیسیوں ریڈیو۔ گراموفون۔ گھڑیاں۔ ٹائپ رائٹر وغیرہ ان کے ہاتھوں شہید ہو کر اپنے بدنصیب مالکوں کو بھوپوجا کی عدیم المثال کاریگری کی یاد دلاتے رہتے۔ دراصل ان کی کاریگری اور ان کے ملنے والوں کی شامت اعمال ایک ہی بات کے دو نام تھے۔

ہمارے ایسے محنت کشوں کے لئے گرمیوں کے زمانے میں اتوار ہی نینی تال مسوری یا شملہ بن جاتا ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ اور جون کی ایک حد سے زیادہ گرم دوپہر۔ تھوڑی دیر قبل اخبار میں پڑھ چکے تھے کہ کل لکھنؤ اور کانپور میں لُو لگ جانے سے قریب بیندرہ آدمی ہلاک ہو گئے تھے اور ہمیں مرنے والوں سے زیادہ اخبار والوں پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر اس قسم کی دل ہلا دینے والی خبریں شائع کر کے وہ معلومات عامہ میں کون سا پُر لطف اضافہ کر دیتے ہیں؟ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند تھیں۔ لیکن لُو کی بھربھراہٹ سے معلوم ہوتا کہ ہمارا کمرہ ہوائی جہاز بن کر ہوا میں پرواز کر رہا ہے۔ ہم نے کمرے کی خواب

اور تاریکی، جماہی لیتے ہوئے دیکھی اور پھر میز کے پنکھے کا رُخ ٹھیک کر کے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔

ابھی ہم نیند کے پہلے ہی پُر کیف جھونکے سے ہمکنار ہوئے تھے کہ ہمیں اپنے دروازے پر ایک شور قیامت سنائی دیا اور ہم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ کوئی صاحب کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ کے تال پر ہمیں چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔ خیال گذرا کہ ایک روز قلفی والے سے کہا تھا کہ کسی روز اتوار کو قلفیاں لے کر ذرا گھر پر آجانا لہٰذا یقیناً اس لو دھوپ میں جب چیل انڈا چھوڑ رہی تھی وہی قلفیاں چھوڑنے آیا ہوگا لہٰذا ہم نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے منہ کھولے بھوپو جا کھڑے تھے۔ ان کے سر پر کوئی ایسا لنگوٹ نما کپڑا کسا ہوا تھا کہ سر کے ساتھ ہی گدی اور کان بلکہ سوائے آنکھ اور منہ کے پورا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ غباری عینک لگی ہوئی تھی۔ میں نے انھیں ان کی بے ڈھنگی جسامت، کرتے پر بیک کی زردوزی اور بٹن سے مستغنی بنڈی سے پہچانا۔ میں ان کی شان نزول کی بے ساختگی پر اپنے استعجاب کا اظہار بھی نہ کرنے پایا تھا کہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولے "کیا کر رہے تھے جی!" اور آگے بڑھتے ہوئے میری خواب گاہ میں پہنچ کر ایک طنزیہ قہقہہ لگایا "اچھا تو دروازے بند کر کے لُو کو بھگا رہے تھے آپ"؟ انھوں نے کچھ اس انداز میں کہا کہ جیسے مجھے جعلی نوٹ چھاپتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ "برخوردار عجیب اُلّو ہو تم بھی! دروازے لاکھ بند کرو کسی نہ کسی دروازے سے لُو گھس آتی ہے اور پھر جب اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو وہ لامحالہ لگ جایا کرتی ہے۔ دیکھو اخبار میں لُو سے جتنی بھی موتیں لکھی ہیں زیادہ تر اسپتال میں واقع ہوئی ہیں جہاں دروازے نہ صرف بند رکھے جاتے ہیں بلکہ ان پر پردے بھی ڈال دیئے جاتے ہیں۔"

میں اس عجیب و غریب انکشاف کو سُن کر کچھ چکرا سا گیا اور بھو پو چا نے بڑھ کر کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں اور نہ صرف آدھے کمرے میں دھوپ پھیل گئی بلکہ پورے کمرے میں لُو کے جھکڑ رقص کرنے لگے۔ بھو پو چا پنکھے کے سامنے جس سے اب ہوا کے بجائے بھاپ نکلنے لگی تھی ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ کچھ دیر انہوں نے پنکھے کو غور سے دیکھا پھر ماتھے پر شکنیں ڈال کر بولے یہ پنکھا چلتے چلتے بل کیوں کھا جاتا ہے"؟ میں ڈرا کہ کہیں بھو پو چا پنکھے کی مرمت پر نہ آمادہ ہو جائیں اور مجھے اپنا وہ گراموفون یاد آگیا جس کی مرمت کرتے کرتے انھوں نے اسے ایک قسم کی موٹر سائیکل بنا دیا تھا۔ لہٰذا میں نے دبی زبان سے عرض کیا "پنکھا نہیں بل کھاتا ہے بلکہ لُو کے جھکڑ سے میز کچھ ہل جاتی ہے"۔ بزرگانہ دلار سے بولے "میز ہلتی ہے تو لاؤ ٹھیک کر دوں فوراً! ذرا آری تو دینا!" عرض کیا "آری نہیں ہے"۔ لیکن بھو پو چا کب رکنے والے تھے۔ پنکھے کو علیحدہ کر کے بیچاری اچھی بھلی میز کو فوراً پچھاڑ دیا اور اپنی جیب سے ایک کلہاڑی نما چاقو نکال کر میز کے پائے چھیلنا شروع کر دیئے۔ پائے جلدی جلدی گھٹنے اور بڑھنے لگے۔ ایک پایہ گھٹتا تو دوسرا پایہ بڑھ جاتا۔ بھو پو چا کی دو گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں میز پہلے کچھ خفیف سی ہلتی تھی اب سیدھی کھڑی بھی نہ ہو پاتی اس کے چاروں پایوں میں سے کوئی بھی دو برابر نہیں تھے۔ چچا باری باری مجھے میری میز، اور اپنے چاقو کو لعنت ملامت کر رہے تھے۔ ایک دفعہ جھنجلا کر مجھ سے مخاطب ہوئے "منہ کیا تک رہے ہو میرا؟ یہ بھی نہیں ہوتا کہ منگل بازار کی نکڑ تک دوڑ جاؤ اور کاشی بڑھئی سے ذرا دیر کے لئے آری مانگ لاؤ؟" منگل بازار کی نکڑ میرے گھر سے دو میل سے کم نہ ہو گی لیکن بہرحال اس لُو اور دھوپ میں دوڑ کر میں آری بھی لے آیا۔ آری کے آجانے سے کم از کم یہ ہوا کہ میز کی

مصیبت جلد آسان ہو گئی جب اس میں سے کٹنے والی ہر چیز کٹ چکی اور وہ محض ایک ہلتا ہوا تختہ رہ گئی تو بھوپو چا بڑے فاتحانہ انداز میں بولے "تو اب جس چیز پر چاہو اسے رکھ کر اس پر نکھار رکھ سکتے ہو۔ میں نے فریاد کی "لیکن یہ تختہ بھی تو ہل رہا ہے" خفا ہو کر بولے "تم بھی عجیب کاہل ہو۔ ارے جس طرف یہ تختہ ہلتا ہے اس طرف ایک کنگلا رکھ لینا۔ تمہارے پاس کیلیں تو ہوں گی نہیں؟ ورنہ ابھی لگا دیتا گنگے"

بھوپو چا بھی اب غالباً تھک چکے تھے۔ یکے بعد دیگرے تین گلاس پانی پی کر بولے "اچھا اب چار بج رہے ہیں۔ میں چلا۔ فقرے کی بھینس بیمار ہے اُسے دیکھ کر دوا دینا ہے ابھی۔ آج کا سارا دن تو تمہاری ہی نذر ہو گیا۔" اور لوٹے کسی بگولے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئے اور مجھے اپنی آنجہانی میز کے کٹے ہوئے ٹکڑوں اور برادے کے ڈھیر کو بٹورنے اور فقرے کی بھینس کی جواں مرگی کا ماتم کرنے کے لئے تنہا چھوڑ گئے۔

حکیم، مستری، معمار، کارپنٹر ہو
جو تم سے شہر میں دو چار ہوں تو کیونکر ہو

ٹکٹ کی درخواست

جناب پریسیڈنٹ صاحب بہادر جنتا سدھار پارٹی!

مجھ گھاسی رام ولد بھکوڑی مل ساکن احمق پور ضلع گوپامئو کا آپ کو بہت، بہت پرنام بلکہ جے ہند پہونچے۔ میں خیریت سے ہوں اور آپ کے بیوی بچوں کی خیریت پرماتما سے نیک چاہتا ہوں۔ شاید آپ نے بھی سنا ہو کہ احمق پور کی جنتا اپنے انتخابی حلقے سے مجھے اسمبلی کا اگلا چناؤ لڑنے کے لئے مجبور کر رہی ہے۔ لہٰذا میری آپ سے دست بستہ گذارش ہے کہ آپ مہربانی کرکے اس حلقے کے لئے مجھے اپنی پارٹی کا ٹکٹ بواپسی ڈاک روانہ فرما دیجئے۔ اپنی اس عنایت سے آپ یہاں کی جنتا پر بڑا احسان کریں گے۔ اور اس کو بے دام خرید لیں گے اور یہاں کی تاریخ میں آپ کا نام ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا احمق پور کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہاں سب احمق بستے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک بھی مان لیا جائے تو آپ کے لئے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اس حلقہ کے لئے آپ اپنی پارٹی کا ٹکٹ کسی سمجھدار آدمی کو دیں۔ میں اپنی سمجھداری کے متعلق خود اپنی زبان سے کیا کہوں بس صرف اس قدر کافی ہے کہ آپ خود اپنی ایک تقریر میں فرما چکے ہیں کہ دوسری پارٹیوں میں شامل ہونے والے بے وقوف اور آپ کی پارٹی میں شامل ہونے والے سمجھدار ہوتے ہیں۔

میری عمر ساٹھ سال سے کچھ اوپر ہی ہو گی۔ مطلب یہ کہ تجربہ کار اور گرگ باراں

دیدہ ہوں۔ اور آپ دیکھیں گے کہ میں اسمبلی میں نوجوانوں کے کان کاٹے بغیر نہ رہوں گا۔ میری صحت اچھی ہے۔ ابھی تین سال ہوئے کہ میں نے تیسری شادی کی ہے۔ عام طور سے لوگ اسمبلی کے ممبر ہو جانے کے بعد شادیاں کرتے ہیں لیکن میں جو اپنے فرائض کی انجام دہی میں آج کا کام کل پر ٹالنے کا سخت مخالف ہوں اپنے اس فرض سے پہلے ہی سبکدوش ہو چکا ہوں۔

میں نے سنا تھا کہ آپ کی پارٹی کے کچھ نیتاؤں کا کہنا ہے کہ پارٹی کو نئے خون کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا خون بھی کسی طرح پرانا یا بوسیدہ نہیں ہے۔ مجھے آپ کی نیک نیتی پر پورا بھروسہ ہے کہ اس بڑھاپے میں آپ مجھ سے خون کی فرمائش ہرگز نہ کریں گے۔ میڈیکل کالجوں اور اسپتالوں میں نئے خون کی سربمہر بوتلیں بکتی ہیں۔ میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ آپ ایک، دو، تین جتنی بوتلوں کی ضرورت ہو فوراً منگوالیں اور ان کا بل مجھے میرے ٹکٹ کے ساتھ بھیج دیں۔ مجھے افسوس ہے کہ خون کی بات کا مجھے اب پتہ چلا۔ ورنہ حال ہی میں میرے قصبہ میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا اس وقت بالکل تازہ اور گرم انسانی خون کی کوئی کمی نہیں تھی جو یوں ہی سڑکوں اور نالیوں میں بے کار بہہ گیا۔ میں اس کی بوتلیں کیا گھڑے آپ کو بھجوا سکتا تھا۔ خیر اب آئندہ ایسی قیمتی غلطی آپ کے سیوک سے ہرگز نہ ہوگی۔

جہاں تک میری تعلیم کا سوال ہے میں اپنے قصبے میں اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی سمجھا جاتا ہوں۔ لیکن اب آپ سے کیا چوری۔ میں پانچواں درجہ فیل ہوں اور اس میں میری نالائقی کا نہیں، میرے پتاجی کی کنجوسی کا ہاتھ ہے۔ میں نے اپنے ماسٹر صاحب کو دس روپے میں درجہ بڑھا دینے کی بات بالکل پکّی کر لی تھی۔ لیکن پتاجی نے کہا کہ میرے لئے پڑھائی سے خچر لادنا زیادہ ضروری ہے۔ اور انھوں نے

دو روپے نہ دیکر مجھے فیل کرادیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سورگباشی پتاجی غلط کہتے تھے غلّے کے خچر لادتے لادتے آج میں احمق پور منڈی کا سب سے بڑا سیٹھ ہوں اور آپ کی دیا سے تین بی اے پاس منشی پچاس پچاس روپوں پر دن رات میری ڈانٹ پھٹکار سن کر مجھے خوش کرنے کے لئے فوراً میری چلم بھر لاتے ہیں یا پیر دابنے لگتے ہیں۔ میں نے خود اپنے لڑکوں کو چوتھے درجے سے آگے نہیں پڑھایا ہے۔ البتہ میری ایک بہو ایم ایس سی ہے۔ میں اسمبلی کا ممبر ہونے کے بعد یہ قانون ضرور پاس کرادوں گا کہ اسکول اور کالج ختم کرکے ہر لڑکے کو ایک خچر خرید دیا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سے دیس کے کاروبار کی کتنی ترقی ہوتی ہے۔

انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس انسپکٹروں کے ڈر سے جو دن رات چھچھوندروں کی طرح میری دوکان کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں، میں اپنی دولت اور آمدنی اپنی نئی نویلی دھرم پتنی کو بھی نہیں بتاتا۔ البتہ اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ آپ سب شُبھ چنتکوں کی دیا سے پرماتما نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ چوربازاری اور نفع خوری کے خلاف میں نے بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ لیکن آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ الا بلا ہے کیا؟ اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ چوروں کو بازار میں نہ گھسنے دیا جائے اور نفع کھانے میں دیر نہ کی جائے۔ تو بھلا کون سمجھدار آدمی چاہے وہ احمق پور ہی کا کیوں نہ ہو، ایسے مہان آدرشوں کی مخالفت کر سکتا ہے آپ تو غالباً کافی سمجھدار آدمی ہیں۔ بے وقوف سے بے وقوف بھی جانتا ہے کہ روزگار ویاپار پیسے نفع کمانے ہی کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور پھر جب نقصان اور خسارے کے بھگتان میں میرا ہاتھ نہیں بٹاتا تو موقع پڑنے پر تھوڑا بہت نفع کما لینے میں کون سی ہتھیا ہے؟ اس سے دوسروں کے پیٹ میں کیوں درد ہونے لگتا ہے؟ جنگ کے زمانے میں اگر میں نے غلّے کے ساتھ تیل، نمک، شکر، سیمنٹ اور لوہے

کالائسنس لے کر اپنی جھوٹی سی کچی دکان کو چار منزلہ عالی شان بلڈنگ میں تبدیل کر لیا تو آخر کس کے گھر ڈاکہ ڈالا؟ اس سے تو میری انتظامی قابلیت ظاہر ہوتی ہے۔ اگر اسمبلی کا ممبر ہو جانے کے بعد مجھے کسی محکمے کا منتری بنا دیا گیا تو میری لیاقت اور تجربوں سے اکیلا میں ہی نہیں بلکہ پورا پردیش لابھ اٹھائے گا۔

ایک صاحب کہتے تھے حالانکہ دیکھنے میں وہ مجھے بالکل جھوٹے نظر آتے تھے، کہ آپ اپنی پارٹی کا ٹکٹ دیتے وقت کچھ قومی خدمات کی بھی چھان بین کرتے ہیں۔ تو صاحب اگر آپ غور سے دیکھیں تو ہمیشہ در بار پارٹی بازوں کی بات چھوڑ کر جنھوں نے غل غپاڑا مچانا اور جیل جانا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا بھلے آدمیوں میں میری خدمات کسی سے کم نہیں ہیں۔ ۱۵ اگست ۴۷ء کو میں نے اپنے مکان پر بڑے ہی زور شور سے چراغاں کیا تھا اور پورے چھ روپے بائیس پیسے خرچ ہوئے تھے۔ راشٹر پتا مہاتما گاندھی کی خبر پا کر وہ شہید ہو گئے ہیں، میں نے اپنی دوکان فوراً بند کر دی تھی۔ چار سال ہوئے شرمدان کے موقع پر میں نے پھاوڑا کاندھے پر رکھ کر ڈپٹی صاحب کے ساتھ تصویر بھی کھنچوائی تھی۔

سال بھر ہوا جب ایک پچکے گال اور پھولی توند والے منتری احمق پور میں آئے تھے تو میں نے ان کی چائے پانی کی دعوت کی تھی۔ اور یقین مانئے پورے بیاسی روپے اکٹھے نئے پیسے کے ماتھے گئی تھی۔ اور جی ہاں خوب یاد آیا، ابھی ایک مہینہ ہوا جب میں نے تحصیلدار صاحب کے کہنے سے پردھان منتری کے باڑھ فنڈ میں پورے تین روپے دیئے تھے۔ اب چناؤ کے سلسلے میں پارٹی کے بہت سے مقامی ممبر آج پندرہ دن سے میری روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ اور میرے خرچے سے اس قدر بیڑیاں پی رہے ہیں کہ ان کے دھوئیں سے میری دکان کے سارے مچھر بھاگ گئے ہیں۔ میں ان کے اخراجات کا پورا حساب بنوا رہا

ہوں اور ٹکٹ ملنے کی رسید کے ساتھ ہی اس کابل آپ کی سیوا میں روانہ کر دوں گا۔

ممکن ہے کہ میرے کچھ دشمن آپ کے کان بھریں کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے میں انگریزی حکومت کا ٹھو تھا۔ اُن کے اشارہ پر ناچتا تھا، اور مجھے رائے صاحب کا خطاب ملا تھا۔ تو صاحب ۱۹۴۷ء کو تو بہت دن ہو چکے ہیں۔ اور پھر اگر انگریزی سرکار مجھے بیوقوف بناتی تھی تو میں بھی تو الٹے استرے سے اس کی حجامت بناتا تھا۔ اگر اس نے ایک ہاتھ سے مجھ سے جنگ کا قرضہ لیا تھا تو میں نے بھی دوسرے ہاتھ سے بہت سے لائسنس اور پرمٹ بٹور لئے تھے۔ اور پھر ہماری پارٹی والے بھی اب وہ کہاں کہتے اور کرتے ہیں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے کہتے اور کرتے تھے۔ کسانوں اور مزدوروں کو کیسے کیسے سبز باغ دکھائے گئے تھے۔ لیکن اب ان بکھمنڈوں کو کون پوچھتا ہے؟ البتہ الیکشن کے زمانے میں ان پر تھوڑی بہت پالش کر دی جاتی ہے۔ میرے ضلعے کے ایک جناب کھادمنتری ہو گئے ہیں پہلے پولس کے مظالم اور ٹیکسوں کی زیادتی کے خلاف چیختے چیختے زمین آسمان ایک کر دیتے تھے پچھلے دنوں ایک بم پولیس کا اُدگھاٹن کرتے ہوئے بولے تھے کہ پولس لاٹھی چارج نہ کرے تو کیا تالیاں بجا بجا کر اور تھرک تھرک کر ناچے۔؟ اور ٹیکس تو بڑھانے کے لئے ہی لگائے جاتے ہیں۔ ورنہ سرکار کا بڑھتا ہوا خرچ کیسے پورا ہو؟ ہر منتری ہر سال نئے ماڈل کی موٹر نہ خریدے تو منتریوں کی برادری میں اس کی ناک کٹ جائے۔ اور پھر دوسرے دیسوں سے غلہ اور قرضہ مانگنے کے لئے یورپ اور امریکہ کا ہر سال چکر کاٹنا بھی تو ان کے فرائض منصبی میں شامل ہو گیا ہے اور پھر نئی نئی اسکیموں کے تجربے کرنے اور بھائی بھتیجوں کو برسرِ روزگار لگانے کے لئے بھی تو آخر روپوں ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ خیر

یہ تو دوسری بات ہے کہنا یہ ہے کہ جب آپ نے بڑے بڑے راجاؤں، مہاراجاؤں
سرداروں اور سابق وزیروں وغیرہ کو نہ صرف پناہ دی بلکہ ان کو ایک دفعہ پھر
بانس پر چڑھا دیا تو ایک چھوٹے موٹے رائے صاحب کو صرف سر چھپانے کی جگہ
دے دینا آپ کے لئے کیا بڑی بات ہے؟ ہاتھی نگل کر چوہے پر ناک بھوں
چڑھانا کم از کم میں تو ایک گھٹیا قسم کا مسخرہ پن سمجھتا ہوں۔

فرقہ پروری کے متعلق آج کل اپنی پارٹی کی طرف سے جو کچھ کہا جا رہا ہے
اس سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اونچی اونچی باتیں کرنے سے کسی کا کیا
بگڑتا ہے؟ اس سلسلہ میں میرا ریکارڈ بالکل صاف اور سادہ ہے۔ میرے
قصبے میں ابھی جو فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا اس میں میں نے کسی قسم کا حصہ نہیں لیا
تھا۔ بلکہ فساد سے قبل فساد کی تیاری میں جو جلسے میرے مکان کے پیچھے احاطے
میں تین روز تک ہوتے رہے تھے ان کی پوچھ گچھ کے وقت پولیس سے اپنی لاعلمی
ظاہر کر دی تھی۔ فساد کرانے والوں نے جب مجھ سے چندہ مانگا تھا تو میں نے
نقد امداد دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ البتہ اپنے گودام سے دو چار لاٹھیاں اور
بم دیتے وقت ان کے خوب کان کھول دیئے تھے کہ خبردار کوئی ہنگامہ میری
دوکان کے سامنے نہ ہو۔ میں انتہائی پرامن شہری ہوں۔ اور پولیس کی پوچھ تاچھ
سے ہمیشہ گھبراتا اور کنی کاٹتا ہوں۔ میرے ادھار کے کھاتے میں مسلمانوں کے نام
ہندوؤں سے کم نہیں ہیں ۔۔۔ اور میں مساوات کا اتنا قائل ہوں کہ جو سود میں مسلمانوں
سے لیتا ہوں اس سے کم ایک پائی بھی ہندوؤں سے نہیں لیتا۔

میرے خلاف امیدوار نے جس نے آپ کا پاس ٹکٹ کی درخواست دی ہے
سنا ہے یہ ہوائی اڑا رکھی ہے کہ میں چونکہ جیل نہیں گیا اور وہ جیل گئے ہیں لہٰذا
ٹکٹ انھیں ملنا چاہیئے۔ تو صاحب یہ بالکل جھوٹ ہے جس زمانہ میں ایسے

پاس جیل میں غلہ سپلائی کرنے کا ٹھیکہ تھا میں ہر آٹھویں روز جیلر صاحب سے ملنے جیل جایا کرتا تھا۔ اس نامعقول نے یہ بھی پروپگنڈا کر رکھا ہے کہ اس نے انگریزی سرکار کے زمانے میں لاٹھیاں بلکہ گولیاں کھائی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بھلا کوئی شخص لاٹھیاں کھا کر کس طرح ہضم کر سکتا ہے۔ اور جہاں تک گولیوں کا تعلق ہے میں اپنے دمے کے مرض کے سلسلہ میں انھیں پچیس سال کی عمر سے برابر کھا رہا ہوں۔ اور یقین مانئے یہ سب گولیاں انگریزوں ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔

ذات پات کے فرق کے متعلق میرا وہی رویہ ہے جو ہمارے بعض چوٹی کے نیتاؤں کا ہے یعنی میں پبلک اور کاروباری زندگی میں اس فرق کو نہیں مانتا لیکن نجی زندگی میں اپنا دھرم نشٹ کرنے اور اپنی برادری میں نکو بننے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ کل ایک گھامڑ نے بھرے مجمع سے یہ سوال کر دیا تھا کہ کیا آپ کسی بھنگی کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں؟ میں نے فوراً ایک لیڈرانہ پینترا بدل کر جواب دیا۔ "اجی آپ یہ کیا مہمل سوال کرتے ہیں؟ آج جب کہ ہر طرف ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم چھوٹ رہے ہیں، ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق مغز پچی کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟" گھامڑ جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور بہت سے لوگ جو میرے جواب سے کچھ نہیں سمجھے تھے یا جو کچھ سمجھنا چاہتے تھے سمجھ گئے تھے فوراً میرے جے کارے لگانے لگے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نہ کبھی کوئی اچھوت میرے گھر کھانا کھانے آئے گا اور نہ میں اس کے گھر کھانا کھانے جاؤں گا لہٰذا اس اٹل حقیقت کے علاوہ باقی سب زبانی جمع خرچ ہے۔ زبان سے کسی کا دل خوش کر دینے میں آخر کیا لاکھ ٹکے خرچ ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ایک چمار کو اپنا بھائی کہہ دیا تھا۔ مارے خوشی کے اس کی باچھیں کھل گئی تھیں، اسے کیا خبر کہ گھر پہونچ کر میں نے گنگا جل سے

اپنی زبان فوراً پوتر کر لی تھی۔

خیر صاحب! یہ تو سب اِدھر اُدھر کی چالو باتیں ہیں۔ معاملہ کی بات صرف یہ ہے کہ آپ اپنی پارٹی کا ٹکٹ مجھے کب بھیج رہے ہیں؟ دیکھئے دیر بالکل نہ کیجئے گا کیونکہ دوسری پارٹیاں بھی مجھے اپنا ٹکٹ دینے کے لئے میرے سر پہ چیلوں کی طرح منڈلا رہی ہیں۔

ہاں ایک بات رہ گئی۔ وہ یہ کہ شراب میں بالکل نہیں پیتا۔ ہولی دیوالی کی بات دوسری ہے۔ البتہ تھوڑی سی افیون ضرور کھا لیتا ہوں۔ بس! اپنے ٹکٹ کے لئے اب اور آپ کو کیا لکھوں۔ تھوڑے لکھے کو بہت جانئے۔ بلکہ اس خط کو دیکھتے ہی اسے بلا ٹکٹ روانہ کر دیجئے۔

میں ہوں آپ کا سیوک

گھاسی رام بقلم خود

مکرر یہ کہ احمق پور کی جنتا آپ کو بہت بہت سلام کہتی ہے اور مجھے ٹکٹ دیئے جانے کے متعلق ایک دفعہ آپ کو پھر یاد دلاتی ہے۔ تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت پر کام آئے۔

چمتکار

مانیہ بھوپوداس ریاست کے کھاد منتری، اس وقت ساری دنیا سے سخت بیزار بلکہ اس کو گولی مار دینے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ جب غصے میں ہوتے تو اپنی بائیں مونچھ اینٹھنے لگتے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی اس حرکت کے باعث ان کی بائیں مونچھ داہنی مونچھ سے چھوٹی ہو گئی تھی اور کچھ لوگ یہ قیاس کرتے کہ ان کی بائیں مونچھ داہنی مونچھ سے پیدائشی چھوٹی تھی اور اس حرکت کی آڑ لے کر وہ اسے برابر کرنا چاہتے۔ بہرحال اس وقت وہ اتنے غصے میں تھے کہ وہ اپنی بائیں مونچھ اینٹھ نہیں بلکہ باقاعدہ نوچ رہے تھے۔

وہ ابھی ابھی ایک دیہات سے نہر کی ایک بلیا کا اُدہ گھاٹن کر کے لوٹے تھے لیکن دراصل آج خود ان کا اُدہ گھاٹن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ گئے تو تھے وہ اس امید سے کہ وہاں باقاعدہ شامیانہ، جھنڈیاں، مان پتر، ہار، دعوت اور ان کی جے کارے لگاتا ہوا ایک بڑا مجمع ہوگا۔ لیکن وہاں کا عجیب ہی عالم تھا۔ ڈپٹی کمشنر، کپتان پولیس اور چند وہ مقامی نیتا جنھوں نے ان کو بڑے اصرار سے بلایا تھا کچھ درختوں کی آڑ میں چوروں کی طرح چھپے کھڑے تھے اور قریب ایک درجن کانسٹبل، تحصیل اور بلاک کے کچھ اہلکار، اندازاً دو ہزار آدمیوں کے ہجوم کو جو کالے جھنڈے لئے کھاد منتری ہائے ہائے"۔ "کھاد منتری واپس جاؤ" کے نعروں کی رٹ لگائے تھا، کبھی لاٹھیاں دکھا کر اور کبھی ہاتھوں کو جوڑ کر روکے

کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ شامیانہ ایک طرف گر پڑا تھا اور ڈائس کے پاس بچی کھچی جھنڈیاں اور ہار کسی عاشق جانباز کے مزار کا نقشہ پیش کر رہے تھے ایسے نازک موقع پر بھوپوداس کی موٹر کا نمودار ہونا بس غضب ہی تو ہو گیا۔ جیسے کسی نے جلتے پر تیل کیا پٹرول چھڑک دیا ہو۔ ہر قسم کی روک ٹوک کو توڑ کر ہجوم ایک بھرے ہوئے طوفان کی طرح اس پر جھپٹا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ڈرائیور نے بڑی عجلت سے موٹر موڑی اور اسے لے کر الٹا بھاگا ورنہ بھوپوداس کے خیال میں آج ان کے پورگباش ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس پر بھی موٹر کے پیچھے اور چھت پر تڑاتڑ کئی ڈھیلے آکر گرے تھے اور بھوپوداس جو اپنی سیٹ پر اوندھے پڑے بڑی رقت انگیزی سے رام دھن گا رہے تھے مارے خوف کے ایک ایک بالشت اچھل پڑے تھے۔

جان بچی لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر آئے، کے مصداق جب ان کی موٹر ان کی کوٹھی کے پورٹیکو میں آکر رکی تو وہ اپنے ہمراہ پرسنل اسسٹنٹ پر برس ہی تو پڑے

"یہ بلیا کا اُدہ گھاٹن تھا یا کسی پاگل خانے کا؟ آپ کلکٹر کا جواب طلب کیجئے"

"بہت اچھا حضور! کلکٹر نے کچھ روز پہلے لکھا تھا کہ وہاں کے لوگ سوکھا پڑ جانے کی وجہ سے بہت بیکل ہو رہے ہیں اور دو تین آدمی بھوک سے مر بھی چکے ہیں۔"

"جھوٹ سب جھوٹ! مجھے تو ایک بھی بھوکا دکھائی نہ دیا وہاں۔ تو پوں کی طرح داغ رہے تھے نعرے اور پھینک رہے تھے ڈھیلے سب!"

"جی حضور!"

"اچھا تم کلکٹر سے کچھ نہ پوچھنا بلکہ اخباروں میں میری ایک تقریر جو مجھے وہاں بولنا چاہیئے تھا چھپوا دو۔ یہی کہ اب کی بار ہمالہ یوجنا میں سرکار وہاں کے لئے پانی کا انتظام کرنے والی ہے اور امریکہ سے اناج کا جہاز آتے ہی گاؤں گاؤں راشن

کی دوکانیں کھول دی جائیں گی۔ اور یہ بھی لکھ دینا کہ بہت شاندار سواگت اور
اُدھ گھاٹن رہا میراث ہ! اس ہی کھڑے ہوئے اردلی کو انھوں نے حکم دیا، دیکھو
میں آج کسی سے نہیں مل سکتا۔ میری طبیعت سست ہے:

اپنے کمرے کی تنہائی میں پہونچ کر مانیہ بھوپو داس ایک طرح سے انگاروں
پر لوٹنے لگے۔ اُدہ گھاٹن کی گڑبڑ تو ایک معمولی سی بات تھی۔ ایک پنساری سے منتری
بن جانے کی لبی سیاسی زندگی میں اُن پر ایسے یا اس قسم کے واقعات بیسوں دفعہ
بیت چکے تھے لیکن آج سویرے کابینہ کی میٹھک کے سلسلے میں ان پر جو حادثہ
گذرا تھا وہ اسے یاد کرتے تو کراہ کراہ اٹھتے۔ ان کی رائے میں آج کے دن کی
ابتدا ہی بڑے بیہودہ طریقے سے ہوئی تھی۔

سویرے کابینہ کی میٹھک ہونے والی تھی، اور چونکہ شرما جی مکھ منتری بیماری
کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہو سکتے لہٰذا قاعدے سے ان کی نیابت یعنی کابینہ
کی صدارت کا حق بھوپو داس کو پہونچتا تھا۔ وہ سب منتریوں میں سب سے زیادہ
سینیر اور ساتھ ہی ساتھ موٹے بھی، مطلب یہ کہ رعب داب والے تھے۔ بھوپو داس
سیاست کے میدان کے پرانے کھلاڑی اور دور کی کوڑی لانے والے گھاگ تھے۔
وہ اڑتی چڑیا کو پہچانتے اور ہوا کے بدلے ہوئے رُخ کو ماہر موسمیات سے پہلے
سونگھ لیتے۔ وہ آج رسمی طور سے مکھ منتری کی نیابت کرنے کے پردے میں اپنے
بہت پرانے خواب کی تعبیر کی پرچھائیں دیکھ رہے تھے۔ ایک دفعہ وہ مکھ منتری
کی گدّی پر جھوٹ موٹ بھی پہونچ جائیں تو آئندہ کے لئے اس پر ان کا حق قائم ہو
جائے گا۔ اور پھر کس کے منھ میں دانت ہیں جو اُن کے جیتے جی ان کو اس سے محروم رکھ
سکتا ہے۔ ایسا غدر مچا دیں گے پارٹی میں وہ کہ اس کی چولیں تک ہل جائیں گی۔
ان کے ہمدرد ایک بہت پہونچے ہوئے سیاسی لال جھکڑ نے ان کے کان میں

پھونک رکھا تھا کہ موجودہ مکھ منتری کے خلاف کچھ سرکاری ٹھیکوں میں گول مال کرنے کے سلسلے میں جو انکوائری برسوں سے چل رہی ہے اس کی رپورٹ مرکزی سرکار کو پہونچ چکی ہے۔ وہ سولہ آنے شرما جی کے خلاف ہے اور مخالف پارٹی کے ممبر اس رپورٹ کو منظر عام پر لانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ پارٹی کا اعلیٰ کمان چاہتا ہے کہ اس معاملے کو رفع دفع کرنے اور پارٹی کی بچی کھچی عزت بنائے رکھنے کے لئے شرما جی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیں اور ان کی اس قربانی کے انعام میں انھیں کسی ریاست کا راج پال بنا دیا جائے۔ عام لوگ اس ہونے والے ناٹک سے بالکل ہی بے خبر تھے لیکن بھوپو داس نے اس میں سوانگ بھرنے کے لئے بہت پہلے سے تیاری شروع کر دی تھی۔ انھوں نے ابھی کچھ ہی دن پہلے اپنے محکمے کی سرکردگی میں ریاست بھر میں ایک، چوہے مار، ہفتہ منوایا تھا۔ اور ریاست کی جنتا کو اپنی رائے میں ان کے آئندہ ہونے والے مکھ منتری سے اچھی طرح روشناس کرانے کے لئے ایک اشتہار میں، ایک موٹے سے چوہے کے مقابل میں اپنی بھی تصویر چھپوا کر جس میں ان کی مونچھیں چوہے کی مونچھوں سے کچھ زیادہ ہی شاندار نظر آتیں ساری ریاست کے ایک ایک کوچے اور گلی میں چپکوا دیا تھا۔ اشتہار کا عنوان تھا "ان کو مارو یہ خطرناک ہیں۔"

کابینہ کی بیٹھک کے وقت کا اعلان نو بجے کیا جاتا تھا لیکن عام طور سے سب منتری دس بجے سے پہلے اکٹھا ہی نہ ہو پاتے۔ خود مکھ منتری کی گھڑی ہمیشہ کم سے کم ایک گھنٹہ سست رہتی۔ آج چونکہ بھوپو داس کو بیٹھک میں شرکت کے لئے زیادہ بے چینی تھی لہٰذا وہ تیار تو ساڑھے آٹھ بجے ہی ہو گئے تھے اور چاہتے تو فوراً روانہ بھی ہو جاتے لیکن اپنی دوراندیشی کے ماتحت انھوں نے کچھ توقف کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ اگر وہ خلاف

معمول وقت سے پہونچ جائیں گے تو اس سے کچھ اوچھا پن ظاہر ہو گا۔ لوگ سوچیں گے کہ وہ مکھ منتری کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے ضرورت سے زیادہ بے چین ہیں۔ ان کا رویہ تو کچھ ایسا ہونا چاہئے جیسے وہ اس کے لئے نہیں بلکہ خود یہ کرسی ان کے لئے تڑپ رہی ہے۔ بات تو جب ہے کہ سارے منتری اور ان کے پیچھے ان کے سکریٹری اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوں اور صدر میں مکھ منتری کی کرسی ان کے انتظار میں کسی عاشق صادق کے آغوش کی طرح خالی پڑی ہو۔ وہ مسکراتے ہوئے کابینہ کے کمرے میں داخل ہوں تو سب اٹھ کر ان کی تعظیم کریں اور وہ اس متانت اور وقار کے ساتھ جیسے ریاست کی ساری پریشانیوں کا بوجھ وہ تنہا اپنے مضبوط کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کرسی کو کھینچ کر اس پر براجمان ہو جائیں۔

کابینہ کے کمرے میں اپنے بھاری بھر کم داخلے کے متعلق انھوں نے ایک کے بعد ایک جتنی بھی تصویریں اپنے ذہن کے پردے پر کھینچیں وہ شاندار سے شاندار تر ہوتی چلی گئیں۔ بھوپو داس کا جی تو یہی چاہتا کہ وہ گھنٹوں بیٹھے یہی شغل جاری رکھیں اور اپنے اس جملہ حقوق محفوظ والے سینما سے لطف اندوز ہوتے رہیں لیکن پھر وہ اپنی فطری بے چینی اور بوکھلاہٹ سے مجبور ہو گئے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ دس بجے سے پہلے پہونچنا قبل از وقت ہو گا۔ وہ ساڑھے نو بجے اپنی موٹر پر سکریٹریٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔

سکریٹریٹ پہونچ کر وہ لپکتے جھپکتے کابینہ کی بیٹھک کے کمرے کی طرف بڑھے تو سیڑھیوں کے پاس برآمدے میں انھیں دیو دت مصرا اور شیخ چراغ اللہ باتیں کرتے ہوئے مل گئے۔ بھوپو داس ان دونوں کو اپنا خاص آدمی سمجھتے لیکن اس وقت ان دونوں کے سلام کرنے اور پھر مسکرانے کے انداز میں انھیں

کچھ ملی بھگت کی بو سونگھ پڑی ریاست میں دیکھنے اور سننے سے کہیں زیادہ ضرورت سونگھنے کی ہوا کرتی ہے، لیکن اس کو نظر انداز کر کے وہ پکارے "میٹنگ میں نہیں چلئے گا؟" اس پر شیخ چراغ اللہ نے پان کی پیک بھرے منھ سے کچھ ایسا غوں غوں جواب دیا کہ سمجھ میں نہیں آیا البتہ اُن کے ہاتھ ہلانے کے انداز سے ۔۔ ایسا پتا چلا جیسے "تو چل میں آ" والا مضمون ہے۔

بھوپو داس آگے بڑھے تو کابینہ کی بیٹھک کے کمرے کی طرف سے قریب قریب سارے منتری جس میں لالہ جھجھول سب سے آگے تھے آتے ہوئے ملے۔ ان کا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے لیکن انھوں نے نمستے کے لئے ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا آج بیٹھک کا ارادہ نہیں ہے؟"

"ہو بھی چکی بیٹھک، نو بجے کا وقت تھا اور اب تو دس بجنے والے ہیں۔ بڑھاپے میں سویرے ذرا جلدی اٹھنا مشکل ہی ہوتا ہے" بھاشکر بابو نے جو لالہ جھجھول کی ناک کے بال تھے چبا چبا کر کہا۔ ان کے آخری جملے پر کئی منتری مسکرا دیئے۔

بھوپو داس پر بجلی سی گری لیکن ریاست کے داؤں پیچ سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ جانتے کہ ریاست میں کوئی شخص اس وقت تک ہار ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ خود اپنی ہار نہ مان لے لہٰذا زہر کا گھونٹ پی کر بھی ہنستے ہوئے بولے "اجی ان پرانے چاولوں کی قدر آپ جانیں؟ وقت پڑنے پر بڑا کام دیتے ہیں یہ!"

"اجی محط میں پرانے کیا نئے چاول بھی غنیمت ہوتے ہیں" لالہ جھجھول نے کہا لیکن بھوپو داس سُنی ان سُنی کر کے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ بڑھاپے والی چوٹ سے وہ اور بھی تلملا اٹھے تھے۔ ادھر چند ہفتوں سے وہ کابینہ کے لئے پرانے خون اور نئے خون کی کچھ باتیں سن رہے تھے لیکن اُن کی سمجھ میں اس کے متعلق کچھ نہیں آیا تھا۔ خود اُن کی عمر قریب اڑسٹھ سال کی تھی لیکن وہ اپنے خون میں کسی قسم کی

بوسیدگی محسوس نہ کرتے۔ ان کے دشمن ان کو کابینہ سے نکالنے کے لیے اس قسم کی ہوائیاں اکثر اڑاتے رہتے۔ اپنے کمرے میں پہونچ کر انھوں نے اپنے اردلی کو حکم دیا کہ وہ فوراً ان کے سکریٹری کو بلا لائے۔

بھیگی بلی بنا سکریٹری آیا تو بھوپوداس اس پر خوفیا دوڑے "کس وقت شروع ہوئی میٹنگ"؟

"نو بجے"

"صدارت کس نے کی؟"

"لالہ جھجوِل نے"

"کس نے پیش کیا تھا ان کا نام"؟

"بھاشنکر بابو نے"

"معاملہ میرے محکمے کا تھا۔ مرکزی سرکار کو ریاست کے غلہ کی مانگ کا پورا بھیجا جانے والا تھا اور میٹنگ میرے بغیر شروع کر دی گئی۔ آپ نے کاغذات کیوں پیش کیے؟"

"مجھ سے کوئی کاغذات مانگے ہی نہیں گئے۔ زبانی یہ پرستاؤ پاس کر دیا گیا کہ چونکہ مکھ منتری بیمار ہیں لہٰذا ان کے نائب کی حیثیت سے لالہ جھجوّل فوراً بذریعہ ہوائی جہاز دہلی جائیں اور مرکزی سرکار کو قحط سالی کی صورت حال بتا کر ریاست کے لئے زیادہ سے زیادہ غلہ الاٹ کرانے کی کوشش کریں"

بھوپوداس کو چکر سا آ گیا لیکن انھوں نے بڑی مشکل سے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا "قحط سالی کی کانفیڈنشل فائل آپ فوراً میرے پاس لے آیئے"

اور پھر جیسے ہی سکریٹری نے ان کو فائل لا کر دی انھوں نے اس کو اپنے

ڈسک کے ڈبل لاک میں بند کر دیا اور اس کی کنجیاں اپنی صدری کی اندرونی جیب میں رکھ لیں۔ ایک ہلکی سی ایسی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی جیسے کسی بھوکی بلّی نے کوئی مسلم چوہا نگل کر اطمینان کی سانس لی ہو۔

بھوپو داس کی الجھن اور گھبراہٹ دیکھ کر ان کی شریمتی جی کے بھی ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ انھوں نے جلدی سے انھیں ہلکا پھلکا کھانا کھلایا اور جلد سو جانے کا مشورہ دیا۔

رات کو گیارہ بج چکے تھے اور بھوپو داس اگر سو نہیں تو جاگ بھی نہیں رہے تھے۔ دفعتاً ان کے سرہانے رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ ٹیلیفون ان کا خفیہ تھا اور اس کا نمبر سوائے ان کے پرسنل اسسٹنٹ اور چند مخصوص دوستوں کے اور کسی کو معلوم نہیں تھا۔ انھوں نے ہڑبڑا کر ٹیلیفون کا چونگا اٹھالیا۔

"ہیلو! میں ہوں بھوپو داس کھاد منتری۔ آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں ہوں تیواری۔ شرما جی مکھ منتری کا ابھی دس بج کر گیارہ منٹ پر راج کوٹلا کے ڈاک بنگلہ میں دیہانت ہو گیا۔ میں چاند نگر سے فون کر رہا ہوں:"

"شرما جی کا دیہانت ہو گیا؟" بھوپو داس کے بجلی کا کرنٹ سا لگ گیا اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔

"جی ہاں جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا وہ آج تین روز ہوئے بحالیٔ صحت کے لئے راج کوٹلا آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ مصر ان کے ڈاکٹر بھی تھے۔ نو بجے وہ سونے کے لئے لیٹے۔ دس بجے انھیں ایک ڈکار آئی اور چند ہی منٹ میں وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔ مرنے سے چند ہی منٹ پہلے انھوں نے آپ کو اطلاع دینے کے لئے بھی کہا تھا۔"

"ظاہر ہے کہ وہ اپنے بعد مجھ کو ہی مکھ منتری بنانا چاہتے۔ بڑے ہی سمجھدار

اور دور اندیش نیتا تھے وہ۔ اچھا تو میں راج کوٹلا کے لئے فوراً روانہ ہو رہا ہوں۔"

"جی نہیں آپ وہاں کے انتظام کیجئے ہم لوگ شرما جی کو لے کر سات بجے سویرے پہنچ رہے ہیں۔ لال چوک کے میدان میں آپ لوگ مل جائیے گا۔"

بھوپوداس جن کے ہوش و حواس اب پورے طور سے بیدار ہو چکے تھے کافی زور سے چیخے "دیکھئے آپ نے مجھے اطلاع دیدی ہے اب آپ کو کسی دوسرے کو اطلاع دینے کی بالکل ضرورت نہیں ہے میں پرستا کی دیا سے سب انتظام ٹھیک کر لوں گا۔"

اور اس کے بعد بھوپوداس نے نہ صرف رات بھر پلک نہیں جھپکائی بلکہ زمین و آسمان کے قلابے ملا کر رکھ دیئے۔ راج پال کو اپنا پرسنل اسسٹنٹ بھیج کر اطلاع۔ کابینہ کے منتریوں، چیف سکریٹری اور صوبہ کے سارے اعلیٰ افسر کو ٹیلیفون۔ اخبار نویسوں کو بیانات۔ صوبے بھر میں تین روز سوگ منانے کے لئے چھٹی کا اعلان۔ تمام سرکاری عمارتوں پر جھنڈوں کے سرنگوں کر دیئے جانے کا حکم۔ چیف سکریٹری اور پولیس کے اعلیٰ افسران سے مشورے کے لئے جنازے کے جلوس کے راستے کی تجویز۔ فوجی گارڈ اور بینڈ کا انتظام۔ سورگ گھاٹ پر انتم سنسکار کا پورا پربندھ۔ وغیرہ وغیرہ۔ مکھ منتری کے اچانک دیہانت سے بھوپوداس سب سے سینئر منتری ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ان کا قدرتی جانشین سمجھنے لگے تھے وہ چاہتے کہ یہ پد سنبھالتے ہی وہ جو پہلا کام کریں وہ انکا چمتکار ثابت ہو اور انکے دوستوں اور دشمنوں پر یکساں طور سے انکی سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت کی ایسی دھاک بیٹھ جائے کہ پھر انکے علاوہ کسی دوسرے کا نام بحیثیت پارٹی لیڈرشپ کرنے کی کسی میں ہمت ہی باقی نہ رہے۔

معمولی سے معمولی جزئیات تک پر بھی بھوپوداس کی دوررس نظریں دیکھ

کر اعلیٰ سے اعلیٰ افسران تک عش عش کر گئے۔ رات کے تین بجے سے سارے شہر کو لاؤڈ اسپیکروں نے سر پر اٹھا لیا۔ مکھ منتری کے اچانک دیہانت کی خبر کے ساتھ ساتھ مانیہ بھوپو داس کی طرف سے جنتا کو نویدن تھا کہ وہ سویرے چھ بجے سے شہر سے باہر لال چوکی کے میدان میں جمع ہو جائیں۔

رات بھر جاگنے اور سر مغزنی کرنے سے بھوپو داس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ ان پر بار بار رومال رکھ کر یہ ظاہر کرنا چاہتے کہ یہ مسلسل آہ وزاری کا نتیجہ ہے۔ بازو پر ایک بڑا سیاہ بلا لگائے وہ ساڑھے چھ بجے لال چوکی کے میدان میں پہونچے تو پندرہ ہزار کے مجمع نے "شرما جی امر ہو گئے" کے ساتھ ہی ساتھ "بھوپو داس زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ فخر اور خوشی کے مارے ان کا سینہ کئی انچ پھول گیا لیکن موٹر سے اترتے وقت انھوں نے مصلحتاً اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا اور تھوڑی سی کمر بھی جھکا لی جیسے وہ مارے غم کے نڈھال ہوئے جا رہے ہوں۔ مجمع کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور اس نے ان کے "زندہ باد" کے دو چار نعرے غم سے بوجھل فضا میں اور پھونک دیئے۔ بھوپو داس کو اپنے علاوہ کوئی دوسرا منتری موقع پر نظر نہ آیا اور وہ دل ہی دل میں مسکرائے کہ اس ساری کارگذاری کا سہرا صرف انھیں کے سر رہے گا۔ انھیں بوڑھا کہنے والوں کو آج منہ کی کھانا پڑے گی۔

سات بجے راج کوٹلا کی طرف سے مکھ منتری کی موٹر اور اس کے پیچھے ایک اسٹیشن ویگن آتی دکھائی دی۔ فوجی سپاہی، پولیس کانسٹبل اور سب افسران اپنی اپنی جگہوں پر چوکنا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بینڈ نے دھیمے سروں میں ماتمی دھن بجانا شروع کر دی۔ مجمع میں کھلبلی مچ گئی اور اس نے بڑے والہانہ انداز میں "شرما جی امر ہو گئے"، "شرما جی امر ہو گئے" کے نعرے لگانا شروع

کر دیئے اور بے اختیار آگے کی طرف جھپٹا۔ اس کو قابو میں رکھنے کے لئے امدادی
پولیس کو تھوڑا سا لاٹھی چارج بھی کرنا پڑا۔ ایک بڑے سے فوجی دستے نے
الٹے ہتھیاروں کے ساتھ دو سمتوں سے پیش قدمی کی اور موٹروں کے یکے بعد
دیگرے رکتے ہی بڑے ضبط و نظم کے ساتھ سلامی دی۔

آنے والی پہلی موٹر میں سے ایک بہت ہی متعجب اور حیرت زدہ، منہ
کھولے اور آنکھیں پھاڑے ریاست کے مکھ منتری شرما جی جلدی سے اتر کر
سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔

الکشن کا موسم

ہمارے علاقے میں اب تین موسم آتے ہیں۔ جاڑا۔ گرمی اور الکشن۔ بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ پہلے ایک موسم برسات بھی ہوا کرتا تھا لیکن جب سے اپنے دیش میں بدیشی گیہوں آنا شروع ہوا ہے اس نے ہماری طرف آنا موقوف کر دیا ہے اور اگر بھولے بھٹکے کبھی نکلتا ہے تو محض شتر غمزہ دکھا کر بھاگ جاتا ہے۔ ساون بھادوں میں بارش کے ایک آدھ چھینٹے اب بھی پڑ جاتے ہیں لیکن شاید صرف کاغذی خانہ پری کے لئے تاکہ برساتی کیڑے مکوڑوں اور کیچڑ کا ہمارا مقررہ کوٹا پورا ہو جائے جل تھل والی برسات اب دیکھنے میں نہیں آتی اور غالب کا یہ شعر حقیقی معنوں میں پڑھنے کی ایک مدت سے توفیق نہیں ہوئی ہے ؎

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ گڑگڑا کر دعا مانگ رہے تھے کہ یا خدایا! امریکہ اور روس میں خوب بارش ہو۔ پوچھا کہ حضرت یہ کیا حماقت کہ آپ اپنے دیش کو چھوڑ کر پرائے دیشوں میں پانی برسنے کی دعا مانگتے ہیں؟ فرمانے لگے کہ اب قدرت بھی انٹرنیشنل ہو گئی ہے۔ ہمارا نام امریکہ اور روس کے گیہوں کے دانوں پر لکھ دیا گیا ہے لہٰذا اب وہیں کے لئے پانی برسنے کی دعا مانگنی چاہیئے۔ دریافت کیا کہ آخر اپنے دیش کے گیہوں کے دانوں پر کس کا نام لکھا ہے؟ تو اپنی عینک صاف کرتے

ہوئے بولے کہ بلیک مارکٹ کی سیاہی پھیل جانے سے وہ اب پڑھنے ہی میں نہیں آتا ہے۔

پنج سالہ منصوبوں کے تحت ہمارا ملک جن دو بڑے خطوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی قحط زدہ اور سیلاب زدہ، اس میں کسی بھول چوک سے ہمارے یہاں کا علاقہ قحط کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ایک سیاسی مجذوب نے ابھی حال ہی میں اپنی پیشین گوئی سے یہ ڈھارس بندھائی ہے کہ بہت جلد وزیر خوراک کا محکمہ تقسیم کر کے دو وزیروں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ وزیر قحط اور وزیر سیلاب اور ان دونوں جانشینوں میں مال غنیمت کے طور پر جب دیش کے خطے پھر سے بانٹے جائیں گے تو انتقل تحول کے موقع پر کسی چھو منتر سے ہمارا علاقہ سیلاب زدہ خطے میں پہونچ جائے گا۔ بہر کیف وہ فاقہ مستی ہو یا غوطہ خوری ہمارے لئے بہر صورت موت برحق ہے۔ ذاتی طور پر ہم وزیر سیلاب کے نامہ اعمال میں اپنا نام لکھانا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں مقابلتاً بعد کی پریشانیاں کم ہیں ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

فی الحال موت کے انتظار کا زمانہ ہم الکشن کے موسم کی دلچسپیوں میں بسر کر رہے ہیں۔

پارلیمنٹ سے لے کر پنچایت تک الکشن کی وہ بھرمار ہے کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ہر سال ضرور آتا ہے بلکہ کبھی تو یہ موسم ایک ہی سال میں کئی بار آ جاتا ہے عوام کی دلچسپیوں کے خیال سے سرکار بائی الکشن اور مڈ ٹرم الکشن بھی کرواتی رہتی ہے۔ اور جب ان سے بھی لوگوں کی تسکین نہیں ہوتی تو وہ خود کسی مقامی سوسائٹی، یتیم خانے یا دھوا آشرم کا چناؤ شروع کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں یعنی مطلب

یہ کہ ایک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق والا مضمون ہے اور جس طرح
ایک پتنگ باز کو پتنگ، بٹیر باز کو بٹیر اور کبھا اور باز کو کچھ اور، چاہیئے اسی طرح
الکشن باز کو کسی نہ کسی بہانے الکشن چاہیئے۔ اور چونکہ بالغ رائے دہندگی کا
زمانہ ہے لہٰذا چاروناچار ہر کس وناکس الکشن باز ہو گیا ہے خواہ وہ ووٹ
مانگنے اور خواہ ووٹ مانگنے والوں سے پناہ۔ خواہ وہ ووٹروں کے پیچھے دوڑے
اور خواہ وہ اس قسم کے پیچھا کرنے والوں کی صورت دیکھتے ہی رسی تڑائے!
بلکہ اکثر تو قید حیات سے چھٹکارا پانے کے بعد بھی الکشن کے بند غم سے نجات
نہیں مل پاتی ہے کیونکہ بعض زندہ دل کسی مرحوم کے نام سے ووٹ ڈالنا صرف
اپنے لیے ایک نفع بخش تفریح سمجھتے ہیں بلکہ مرحوم کی روح کو ثواب پہونچانے
کا ایک دلچسپ طریقہ۔

الکشن کے موسم میں نہ گرمی لگتی ہے نہ سردی بلکہ موسم خود اختیاری ہو جاتا
ہے۔ برسات کی طرح کیچڑ بھی زیادہ نظر نہیں آتا ہے کیونکہ اس کا بیشتر حصہ
امیدواروں اور ان کے حامیتوں پر اچھال دیا جاتا ہے۔ بارش کے نعم البدل کے
طور پر تقریریں برستی ہیں، بادلوں کے بجائے لاؤڈ اسپیکر گرجتے اور بجلیوں کی جگہ
نعرے کڑکتے اور مینڈکوں کی طرح امیدوار اور ان کے ورکر ہر طرف پھدکتے اور
ٹراتے نظر آتے ہیں۔

اس کے فائدے دیکھ کر تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر کسی ترکیب
سے ہمارے ملک میں مستقل طور سے ہمیشہ الکشن ہی ہوا کرے تو ہمارے سارے دلدر
خود بخود دور ہو جائیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی
شخص بیکار نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ جو پہلے سب سے زیادہ بیکار نظر آتا ہے وہی سب
سے زیادہ برسر کار بلکہ آمادہ بہ پیکار دکھائی پڑتا ہے۔ کبھی جلسے پر ڈھیلے پھینک

رہا ہے، کبھی جلوس میں نعرے لگا رہا ہے، کبھی ایک امیدوار کے پوسٹر پھاڑ رہا ہے کبھی دوسرے امیدوار کے پتلے کی ارتھی کاندھوں پہ سنبھالے شمشان بھوم جا رہا ہے۔ اور کچھ نہ سہی تو کسی گروہ کے درمیان کھڑا مختلف امیدواروں کی کامیابی اور ناکامیابی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے آستینیں چڑھا رہا ہے اور کسی نہ کسی طریقے سے نقص امن کو خطرے میں ڈالنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔
ہمارا پڑوسی گھاسو عرصے سے بے روزگار تھا لیکن الکشن آتے ہی دو ڈیفٹ پر کام کرنے لگا ہے۔ دن میں ایک امیدوار کی جانب سے دو پیسے فی پوسٹر کے حساب سے چپکاتا اور رات میں دوسرے امیدوار کی طرف سے اپنے ہی لگائے ہوئے ایک پیسہ فی پوسٹر کے حساب سے نوچتا پھرتا ہے۔ ردی بیچنے سے چائے اور بیڑی کا خرچ الگ نکل آتا ہے۔ بدھو خاں جن کا دن رات تاش کھیلنے کے علاوہ دوسرا کام نہ تھا اور جن کا سیاست سے صرف اتنا ناجائز تعلق تھا کہ وہ اخبار میں خبروں کے بجائے صرف اشتہار پڑھتے اس خود فراموشی سے الکشن میں غرق ہو کر ووٹروں کے سروں پر کسی آسیب کی طرح سوار ہو گئے ہیں کہ ان کا کھانا، پینا، چائے اور سگرٹ بلکہ حجامت تک ووٹروں کے ذمے ہو گئی ہے۔ البتہ اُن کے امیدوار کے یہاں سے اُن کی تنخواہ ماہ بماہ گھر پہونچ کر ان کے بیوی بچوں کو ان کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

حق رائے دہندگی کیا سرکار نے تو ہر شخص کو ایک ایک سادی چک دے رکھی ہے۔ اب جس کا جی چاہے اُسے اپنی اپنی ہمت اور حوصلے کے مطابق بھنا سکتا ہے۔ نتھو نے اُسے ایک بیڑی پر گنوا دیا اور بالے اسی کے بل بوتے پر ایک ڈکارتی ہوئی بھینس لے آیا۔ بالے نے جب اپنے امیدوار ہونے کا اعلان کیا تو سارا محلہ اس کو دیکھ کر بے ساختہ ہنستا کہ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے لیکن جب

سیٹھ کچوری مل کی چمچاتی ہوئی لانبی سی موٹر اس کے دروازے پر آکر رکی اور انھوں نے ہاتھ جوڑ کر پندرہ سو روپوں کے بدلے اُسے امیدوار سے پھر انسان بنا دیا تو وہ محلے والوں کی متعجب صورتوں پر قہقہے لگانے لگا، اور وہ سب کبھی اس کو اور کبھی ان روپوں سے خریدی ہوئی اُس کی بھینس کو رشک و حسد سے دیکھتے رہ گئے

یوں تو الکشن کا ہنگامہ جیسے جیسے برپا ہوتا اور بھرتا ہے بازار میں بکنے والی ہر چیز کی مانگ بڑھ جاتی ہے خواہ وہ فریق مخالف پر پھینکنے کے لئے گندے انڈے ہوں خواہ ورکروں کے لئے دوڑتے دوڑتے جلد ٹوٹ جانے والی چپلیں ہوں اور خواہ بے زبان دیواروں کو شوخیٔ تحریر سے فریادی بنانے کے لئے ناخواندہ اور بدخط محرر۔ مگر قابل تعریف بات تو یہ ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ایسی چیزیں بھی بکنے لگتی ہیں جن کو اس سے پہلے بکاؤ مال ہرگز نہ سمجھا جاتا۔ ووٹ کا بھاؤ تاؤ چھوڑیئے۔ یہ تو اب پرانی بات ہو چکی۔ اب تو کسی جلوس کا کامیاب بنانے کے لئے کرائے پر شرکت کرنے والے بلائے جاتے ہیں۔ فریق مخالف کے جلسے کو درہم برہم کرنے کے لئے غنڈوں کے چودھریوں کی مٹھی گرم کی جاتی ہے اور "زندہ باد" اور "ہائے ہائے" کے نعرے لگانے کے لئے اجرت دے کر محلے کے لڑکوں کا غول بیابانی اکٹھا کیا جاتا ہے۔ سڑے گلے پھلوں اور ترکاریوں کو تازہ پھلوں اور ترکاریوں سے بھی زیادہ قیمت پر خرید کر ان سے چاندماری کرنے کے لئے ماہر اور مستند نشانہ بازوں کو منھ مانگی فیس پر مدعو کیا جاتا ہے۔

ہمارے علم میں تو یہاں تک ہے کہ ان کے مالکوں کو باقاعدہ معاوضہ دیکر دو چھٹ کر بے تحاشا بھونکنے اور پیچھا کرنے والے کتوں کی خدمات اس غرض سے حاصل کی گئی تھیں کہ محلے میں جب ایک مخصوص امیدوار کے ورکر آئیں تو وہ ان پر چھوڑ دیئے جائیں۔ اور پھر یہ تجربہ کچھ ایسا کامیاب ثابت ہوا کہ وہ کتے

حسب ضرورت مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر انھیں ورکروں پر چھوڑے گئے تھے۔ ایک مدت تک یہ ورکر پھر کہیں دکھائی نہیں پڑے اور پھر جب دکھائی پڑے بھی تو وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اپنے دائیں بائیں ایسا مڑ مڑ کر دیکھتے چلتے جیسے ہر قدم اٹھانے سے قبل وہ اپنے کاندھوں پر بیٹھے کراماً کاتبین سے مشورہ کرتے جاتے ہیں۔

فنون لطیفہ کو الکشن کی بدولت ایک نئی زندگی مل جاتی ہے۔ بلکہ کچھ نئے فنون عالم وجود میں آجاتے ہیں۔ ایسے بوسیدہ شعراء کو جنھیں گراموفون کے گھسے پٹے ریکارڈوں کی طرح طاق نسیاں پر رکھا جا چکا تھا، جلسوں میں اسٹیج پر کھڑے پھر اپنی جرخی داغتے ہوئے دیکھا جانے لگتا ہے۔ وہ دہشت انگیز مقرر جن کی آتش بیانی سے صحت عامہ کو محفوظ رکھنے کے لئے سرکار کبھی مر قبران کو اپنا خصوصی مہمان بنا چکی تھی از سر نو گرجنے اور ڈکارنے اور حواس باختہ عوام کو یہ بشارت دینے لگتے ہیں کہ فلاں امیدوار کو ووٹ دینے کر دنیا اور عقبیٰ دونوں سدھر جائیں گی ورنہ جہنم سے ادہر کہیں بھی جائے قرار نہ مل سکے گی اور حشر کے دن روسیاہ اٹھنا پڑے گا۔ ایسے ایسے کرم خوردہ ادیب جنھوں نے اپنے بچپن میں کوئی مضمون لکھ کر کسی جواں مرگ پرچے میں چھپوادیا تھا کسی مال مسروقہ کی طرح غیر متوقع طور سے برآمد ہو کر امیدواروں کے آباواجداد سے لے کر ان کی اولادوں تک کے نامۂ اعمال سیاہ کرنے لگتے ہیں۔ ڈھول پیٹتے ہوئے مسخرے گلی گلی ناچتے کودتے اور تالیاں بجا بجا کر گاتے نظر آتے ہیں اور ان کے دفعان ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک ہونہار لڑکوں پر ان کا بھوت سوار رہتا اور وہ ان کی نقل کرتے رہتے ہیں۔ ان کی جدید شاعری کا ایک بند جو نسبتاً سنجیدہ اور قابل اشاعت ہے ملاحظہ ہو:۔

سنو بھائی سنو: ایک تھا موٹا بچہ (ایک امیدوار ضرورت سے زیادہ تندرست تھا)

کھا گیا انڈا کچا (اس کی انڈا چوری پر چوٹ ہے)
آ گیا اس کا چچا (اس کا مخالف امیدوار جس کی حمایت مقصود ہو)
پھر کھا گیا وہ غچا (یعنی ہار گیا)

ہائے ہائے! ہائے ہائے!

پرانی دوستیاں اور دشمنیاں از سر نو تازہ ہو جاتی ہیں۔ "آپ کے خالو میرے چچا کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے اور دونوں کی بیویوں کو ایک ساتھ تپ دق ہوئی تھی لہٰذا اپنی خالہ کو ایصال ثواب کے لئے مجھے ووٹ دیجئے۔"

"آپ کے نانا پر جعلی نوٹ بنانے کا جو مقدمہ چلا تھا اس کی مخبری میرے مخالف کے چچیا سسر نے کی تھی لہٰذا اپنی نانی کا گھر اجڑنے کے غم میں اس نا شدنی کو ہرگز ووٹ نہ دیجئے۔"

"اجی وہ وہابی تو کسی رافضی سے بھی بدتر ہے۔ آپ اس کو ووٹ دے کر میدان حشر میں اپنے پیر و مرشد بھوند و شاہ کو کیسے منہ دکھائیے گا۔"

"ان بنیوں کو منہ لگانے سے آپ اپنی بھٹناگر برادری کے منہ میں سیاہی لگا رہے ہیں۔ خیال تو کیجئے اگر آج آپ کے تیاجی زندہ ہوتے تو وہ کیا کرتے؟"

برادرانہ اخوت کے مظاہرے کے لئے یہ بہترین وقت ہوتا ہے۔ رام داس میرے مکان کے سامنے برسوں سے رہتا لیکن مجھے اس کی ذات کا علم اس وقت علم ہوا جب اس نے ایک امیدوار کو یہ کہہ کر منہ چڑا دیا "میں اپنی کورمی برادری کے بھگوڑے داس کو چھوڑ کر بھلا آپ کو کیسے ووٹ دے سکتا ہوں؟"
مولوی بخت اللہ جو اپنی بڑی سی سفید داڑھی کی رعایت سے بطخ اللہ کہلاتے ہیں صاف کھلے الفاظ میں اعلان کر دیا کہ میں ٹھہرا دیوبندی لہٰذا کسی بریلوی کو ووٹ دے کر اپنی عاقبت خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔"

کلب حسین اپنی مرثیہ خوانی کے بل بوتے پر شیعہ ووٹروں کو اپنی جیب میں ڈالے پھرتے لیکن غلام غوث کو ناز تھا کہ ایک بھی سُنی ووٹ ان کے کیمپ میں پر نہیں مار سکتا۔ پنڈت اُدھم پرشاد نے گئو بدھ کا جھنڈا لے کر سارا حمرودہ فتح کر ڈالا تھا اور بھوپے داس جب سے ایک دن ہوٹل کی پیالی میں چائے پیتے دیکھے گئے تھے، ہندو جنتا میں منھ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مولوی مخدوش اللہ ووٹ مانگنے کے ساتھ ہی جزدان میں لپٹی ہوئی طلسم ہوش ربا کو مسلمانوں کے سروں پر رکھتے جاتے اور ہڑبونگ داس جب کسی ہندو ووٹر سے ووٹ دینے کا وعدہ لے چکتے تو اسے دوسری بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس پر اپنی جیب سے بوتل نکال کر تھوڑا سا اپنے گھر کے کنوئیں کا پانی بھی چھڑک دیتے۔ غریب مسلمان یہ سمجھتا کہ اس نے قرآن اور بیچارا ہندو یہ جانتا کہ اس نے گنگا جل اٹھا لیا ہے اور دونوں ہی صید زبوں ہو کر رہ جاتے۔

سچ تو یہ ہے کہ ایمان اور دھرم، جو ملاوٹ اور چور بازاری، رشوت خوری اور سینہ زوری کے وقت نہیں معلوم کہاں غائب ہو جاتا ہے صرف الکشن کے دم سے ہمارے اور آپ کے درمیان باقی اور سلامت ہے اور اس موسم میں ہر طرف اس کا بول بالا نظر آتا ہے۔ اور پھر ایمان اور دھرم میں بھی تو شاخ در شاخ ہیں۔ آپ کا کسی ایک مذہب سے تعلق رکھنا کافی نہیں ہے۔ ووٹروں کے مخصوص حلقوں کے لئے آپ کا نہ صرف حادثہ پیدائش سے کسی ایک مذہب کا لیبل لگا کر پیدا ہونا ضروری ہے بلکہ اس کی کسی ایک جملہ حقوق محفوظ والی ذات برادری، عقیدت اور عمل سے متعلق ہونا بھی لازمی ہے۔ ووٹر اتنا سمجھدار ہو چکا ہے کہ وہ محض ہاتھی دیکھ کر نہیں بلکہ اس کی دم، کان، سونڈ، وغیرہ ٹٹول کر اپنا قیمتی ووٹ استعمال کرتا ہے۔ دھارمک سنستھائیں اور تبلیغی جماعتیں برسوں کی

محنت کے بعد بھی وہ مذہبی جوش و خروش نہیں پیدا کر پاتیں جو الکشن کا موسم چٹکی بجاتے چند دنوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

مادی طاقتوں کے ساتھ روحانی طاقتیں بھی الکشن کے اکھاڑے میں زبردستی کھینچ بلائی جاتی ہیں۔ فتو خاں چپکے سے جاکر بو کھل شاہ کے مزار پر ایک دیگ کی منت مان آئے۔ ان کا یہ داؤں دیکھ کر بدھو رام نے گربڑ داس کی سمادھی پر فوراً کیرتن کروا دیا، کیونکہ ان کی رائے میں تیرہ ادھار سے نو نقد بہتر ہوتے ہیں۔

پارٹی لیبل تو محض جھنڈیاں بنانے اور جھنڈا پھیرانے کے کام آتے ہیں کسی پارٹی کا الکشن مینی فسٹو نہ کوئی ووٹر پڑھتا ہے نہ پڑھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے بلکہ اس کے بجائے وہ کسی ایک ہفتہ پرانے اخبار کو پڑھ لینا زیادہ غنیمت سمجھتا ہے۔ مینی فسٹو کو محض شگون کے لئے ایک رسمی خانہ پری جان کر پارٹی کے ورکر الکشن کے پہلے ہی چھینٹے میں اُس کے بنڈلوں کو پنساری کی دوکان پر بیڑی اور دیا سلائی میں تبدیل کرا لیتے ہیں۔ اُن کی رائے میں ووٹروں کو ووٹ صرف امیدوار کی ذاتی شخصیت پر دینا چاہیئے نہ کہ پارٹی کے الٹے سیدھے وعدوں پر۔ اور یہ شخصیت بنتی ہے موٹروں، ورکروں، جھنڈے، جھنڈیوں، جلسے، جلوسوں، نعروں اور لاؤڈ اسپیکروں سے جس کے لئے ایک چھوٹا سا جامع لفظ روپیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ الکشن میں جیت اور ہار کے لئے کسی امیدوار کی تعلیم، تجربہ، قربانی اور قابلیت ایسی ہی غیر متعلق سمجھی جاتی ہے جیسے کسی فلم کے ہٹ یا فلاپ ہونے کے لئے اس کے دکھلائے جانے سے پہلے نیوز ریل۔ نگر پالیکا کے چناؤ میں ایک امیدوار جب اپنی ڈگری دکھلاتا تھا تو دوسرا امیدوار اپنی مونچھ اور بالا خر پالا مونچھ ہی کے ہاتھ رہا۔

اور پھر ہمارا سمجھدار ووٹر جو جمہوریت کے لال قلعے کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے گھومتا ہے، ووٹ کیسے دیتا ہے؟ شکور بابا تم کھاکر گئے تھے کہ وہ شیر کو ووٹ دیں گے لیکن بلیٹ پیپر میں بنا ہوا ننھا سا اونٹ ان کے دل کو کچھ ایسا بھا گیا کہ وہ چپکے سے اسی پر نشان لگا کر چلے آئے۔ رامو ہاتھی کو ووٹ دینا چاہتا تھا اس کے دادا ریاست اندھیر پور میں فیلبان رہ چکے تھے۔ لیکن جب بلیٹ پیپر میں اُسے کوئی ہاتھی نظر نہیں آیا تو اس نے غصّے میں ہوائی جہاز پر مہر لگادی کیونکہ اس کی رائے میں ہاتھی سے اونچا ہی جانور ہو سکتا تھا۔ بٹو بوا کا مرغا کھو گیا تھا اور وہ اس کے سوگ میں نڈھال ہو رہی تھیں۔ سائیکل والے کی طرف سے جب وہ گھیر گھار کر پولنگ بوتھ تک لائی گئیں تو بلیٹ پیپر پر اپنے گم شدہ مرغے کی تصویر دیکھ کر وہ جذبات سے بے قابو ہو گئیں اور ان کا ہاتھ اسی پر چل گیا اور اپنی دانست میں اللہ میاں کے تھانے میں انھوں نے اپنی مظلومیت کی رپٹ لکھادی۔ جھبو کے ہاتھ میں الٹا بلیٹ پیپر آگیا۔ وہ ووٹ تو دینا چاہتا بالٹی کو لیکن جب بالٹی دکھائی نہ پڑی تو وہ دو بیلوں کی جوڑی کی اوپر اٹھی ہوئی ٹانگیں دیکھ کر ان کو کنوئیں سے پانی نکالنے والا پمپ سمجھا اور اپنی موٹی عقل سے یہ جان کر کہ بہر حال بالٹی سے کہیں زیادہ پانی پمپ میں آتا ہے اس نے اسی پر ٹھپہ لگا کر اپنا فرض پورا کر دیا۔ جھبر و سنگھ نے میز پر بلیٹ پیپر رکھا اور دانت بھینچ کر سورج پر اس زور سے ٹھپہ داغنا چاہی کہ ان کی جنبش کی آندھی سے کاغذ کھسک گیا اور ان کا نشان سورج کی کرنوں کے بجائے ان کے جانی دشمن کے شیر کی مونچھوں پر جالگا۔ وہ بھیگی بلی بنے بوتھ سے نکل بھاگے۔

ہمارے دوست ہربرداس اور کھٹ بٹ خاں دنیا کے تمام مسائل میں

سے صرف اس مسئلہ پر خلاف توقع متفق ہیں کہ جب بیشتر الکشنوں میں ہر قسم کی تھکا فضیحتی کے بعد روپیہ ہی فیصلہ کن ہتھیار ثابت ہوتا ہے تو سرکار کو چاہیئے کہ وہ الکشن کرانے کے بجائے نشستوں کا نیلام کرادیا کرے۔ ان کی رائے میں محض اس نیلام سے اتنا روپیہ آجائے گا کہ پھر کسی ٹیکس لگانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی اور اگر کچھ رہ بھی گئی تو وہ نیلام کے موقع پر فیس داخلہ سے پوری ہو جائے گی۔ ہڑبڑ داس نے ایک فیصلہ کن ڈکار لیتے ہوئے کہا "بیوقوف لوگ کہیں گے کہ اس میں سے ملک میں سرمایہ داروں کا دوردورہ ہو جائے گا اور میں کہتا ہوں کہ اس وقت ملک میں سرمایہ داروں کا جو دور دورہ ہے اس کو ختم کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے سیدھی ٹکر دے دی جائے"۔ کھٹ پٹ خاں نے اپنی مونچھ اُمیٹھتے ہوئے تائید کی" اور پھر اگر راشٹرپتی، راج پال، مکھ منتری اور منتری وغیرہ کے عہدے بھی نیلام ہونے لگیں تو ہمارا دیش بہت جلد اس قابل ہو جائے گا کہ وہ لینے کے بجائے الٹا امریکہ اور روس کو قرضہ دینے لگے گا۔"

ہمارے دوستوں نے اپنی اس تجویز کے پرچار کے سلسلہ میں جو پارٹی بنائی ہے اس کے وہی دو ممبر ہیں اور مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ دونوں ہی اس کی صدارت کے امیدوار ہیں۔ دونوں ہی ہر وقت ایک دوسرے کو اپنا اپنا مینی فسٹو سناتے اور اپنے اپنے لئے ووٹ مانگتے رہتے ہیں۔ عہدہ نیلام کیا جاتا ہے تو بولی کروڑوں اور اربوں تک ہو پہنچ جاتی ہے کیونکہ دونوں ہی گھاگ ہیں اور جانتے ہیں کہ صدر منتخب ہو جانے کے بعد یہ روپیہ وصولی اور خرچ کرنے کا اختیار صرف اُسی کو

باقی رہ جائے گا۔

اس نوزائیدہ بلکہ نیم زائیدہ پارٹی کے مستقبل کے متعلق فی الحال کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی ہے ؎

رنگ دکھلائے گی جب اترے الکشن تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو بلیٹی کا م دو دہن کی آزمائش ہے

———— ⁘ ————

ایک تجربہ

ریسٹوراں میں بعد دوپہر داخل ہوا تو وہ قریب قریب خالی تھا۔ میں حسب عادت درمیانی جگہیں چھوڑ کر ایک کونے میں کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا اور بیرے کو کھانے لانے کے متعلق ہدایتیں کر کے میز پر پڑے ہوئے ایک پرانے بالتصویر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ دفعتاً مجھے اپنے بائیں کان کے قریب یہ آواز سنائی دی: "اچھا تو یہ آپ ہیں؟" میں چونک پڑا اور گردن گھما کر دیکھا تو میرے پاس ایک مختصر پاکٹ اڈیشن قسم کا دبلا پتلا پستہ قد اور چرب زبان قسم کا انسان بش شرٹ اور پتلون پہنے کھڑا بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ سر سوائے کنپٹیوں کے، بالوں کے تکلفات سے آزاد تھا۔ چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں سنہرے فریم کی عینک کے پیچھے جلد جلد حرکت کر رہی تھیں اور ان کے ساتھ ہی غالباً اس کے پتلے پتلے ہونٹ بھی ہل رہے تھے۔ عمر تو شاید پچاس اور پچپن کے درمیان ہی میں ہو لیکن گورے چٹے چہرے پر جھریوں کا کچھ ایسا جال بچھا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا چہرے پر بیک وقت ایک عینک کے بجائے کئی عینکیں لگی ہوئی ہیں۔ بشرے سے پہلا اندازہ یہی ہوتا کہ انتہائی ذہین، تیز طرار، لیکن شریف آدمی ہے۔

میں کچھ گھبرا کر کھڑا ہو گیا! "معاف کیجئے گا، مجھے شاید اس سے پیشتر آپ سے نیاز نہیں حاصل ہوا۔"

میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا: "دراصل میں بھی آپ کو نہیں جانتا ہوں۔ لیکن کیا عرض کروں پشت سے آپ کا سر دیکھ کر مجھے مغالطہ ہوا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ میرے دوست رام دیال بھٹناگر ہیں۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں، مداخلت کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو مل گیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی اسی میز پر کھانا منگالوں۔"

"بڑی خوشی سے!" میں اس کے علاوہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

بیرا آیا تو اجنبی نے کھانے سے متعلق اپنے اعلیٰ مذاق کا ثبوت دیتے ہوئے صرف بہترین چیزوں کا آرڈر دیا اور میرے شدید انکار کے باوجود کچھ چیزیں میرے لئے بھی منگوائیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی انگلیوں میں کئی بیش قیمت انگوٹھیاں تھیں اور بائیں ہاتھ کی کلائی پر ایک بہت خوبصورت سنہری گھڑی سونے کی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی۔

کچھ دیر تک مجھے بڑی سنجیدگی سے گھورنے کے بعد بولا: "بڑا خراب زمانہ ہے آج کل۔ ہر طرف جھوٹ، مکر اور فریب کا بازار گرم ہے۔ ہر کوئی دوسرے کا گلا کاٹنے پر تلا ہوا ہے۔ کسی شخص کا بھی کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ غالب نے بالکل درست ہی کہا ہے ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا "زمانے کے متعلق حساس لوگوں کو ہمیشہ ہی شکایت رہی ہے۔ ہر دور میں آپ کو لوگ یہی کہتے ہوئے ملتے ہیں کہ موجودہ زمانہ سب سے زیادہ خراب ہے۔"

کچھ فلسفیانہ انداز سے بولا: "ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن موجودہ زمانے میں ہم جو باتیں دیکھ رہے ہیں وہ پچھلے زمانوں کے متعلق سنی بھی نہیں

تھیں۔ آپ تو یقین مانیئے گا ہر طرف ننگا ناچ ہو رہا ہے اور انسان اپنی انسانیت بالکل ہی فراموش کر چکا ہے۔"

کھانا آگیا اور ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر تک میرا ساتھی کافی مشغول رہا پھر ایک نئے جوش سے بولا۔ "تجارت نام ہے ملاوٹ اور منافع خوری کا۔ ملازمت نام ہے کام چوری کا اور رشوت کا۔ سیاست نام ہے چرب زبانی اور جاہ طلبی کا۔ شرافت نام ہے غریبوں سے نفرت اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا۔ رفاقت نام ہے خود غرضی اور دست کشی کا۔ بس کیا عرض کروں محبت، ہمدردی اور خلوص کہیں نام کو نہیں۔ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے۔"

میں نے کچھ تلخی دور کرنے کے لئے ازراہ تمسخر کہا! "ابھی آپ نے بہت سے قافیئے چھوڑ دیئے ہیں۔"

سنی ان سنی کر کے فرمایا۔ "یہ کیفیت دیکھ کر سچ پوچھیئے تو اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔ دوسروں کی صورت کیا، خود اپنی صورت سے دل بیزار ہو گیا ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ ؛ ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ خودکشی کے آخری مراحل طے کر رہے ہیں کچھ ڈھارس دلانے کی کوشش کی۔ "آپ نے جو کچھ فرمایا وہ ایک حد تک درست ہے لیکن انسان کی انسانیت سے کبھی مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ انسان اگر فرشتہ نہیں تو وہ نرا شیطان بھی نہیں ہے۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ ہر انسان فطرتاً نیک اور معصوم ہوتا ہے یا کم از کم اس میں ہمدردی، محبت اور ایثار کی بڑی صلاحیتیں ہوتی ہیں، البتہ ہمارا نظام زندگی ہی کچھ ایسا بن گیا ہے کہ

اس میں ایک کا فائدہ دوسرے کے نقصان پر منحصر ہے۔ چنانچہ خود غرضی ہماری زندگی کا ایک جزو لاینفک بن کر رہ گئی ہے ۔"

کچھ تلخی سے بولا " معاف کیجئے گا، میں اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں کا قائل نہیں۔ آپ کی رائے میں انسان کی خود غرضی کا ذمہ دار اس کا نظام زندگی ہے لیکن یہ نظام زندگی بناتا کون ہے؟ انسان بنیادی طور سے خود غرض اور نفس پرست نہ ہوتا تو وہ ایسا نظام زندگی بناتا ہی کیوں؟ یہ کچھ نہیں! انسان شیطان ہے بلکہ مجھے تو یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ جس طرح شیطان معلم الملکوت تھا اسی طرح انسان معلم الشیاطین ہے :

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسے دل جلے انسان سے گفتگو کرنا بیکار ہے میں نے عرض کیا! " موجودہ نظام زندگی سب انسانوں کی رائے اور مرضی سے کہاں قائم ہوا ہے ورنہ آج اتنی بھاری اکثریت فاقہ کشی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی بسر کرنے پر ہرگز مجبور نہ ہوتی۔ اس کو تو صرف مٹھی بھر انسانوں نے طاقت، دولت اور دوسرے انسانوں کی ناواقفیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر زبردستی مسلط کر دیا ہے......"

میری بات کاٹ کر کہنے لگا: " یہ کچھ نہیں انسان اپنی جبلت اور خصلت ہی سے مفسد، لالچی اور بدمعاش واقع ہوا ہے اور دوسروں کو تکلیف پہونچا کر اپنی تن آسانی کے سامان فراہم کرنا اس کا محبوب ترین مشغلہ ہے ۔"

میں نے عرض کیا! " معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف آپ کو کچھ بہت ہی تلخ تجربات سے دوچار ہونا پڑا ہے؟"

منھ بسور کر بولا ! " تلخ تجربات ! اجی ! " عمر گزری ہے اسی دشت

کی سیاحی میں، اعزا کی غداریاں، دوستوں کی ایذا رسانیاں، محبوبوں کی طوطا چشمیاں، شناساؤں کی مکاریاں، بس کیا بتاؤں کس کس کو روؤں؟ مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں، اب تو میرا عقیدہ بلکہ ایمان ہے کہ انسان پکا بے ایمان ہے۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا: "خیر یہی شکر ہے کہ ابھی کچھ لوگ تو ایسے باقی ہیں جو دوسروں کو بے ایمان کہہ سکتے ہیں۔"

"جی ہاں! اسی تناسب سے جس طرح کسی ریگستان کے مقابلے میں ایک مٹھی بھر ریت۔ یوں تو ایک خود میں ہی ہوں جس نے انتہائی صبر آزما حالات میں بھی اپنی انسانیت کو خیرباد نہیں کہا۔ ابھی پرسوں ہی میں ریل سے آ رہا تھا کہ ایک ہم سفر بلا ٹکٹ پکڑ لیا گیا۔ اس کی جیب میں سوائے ایک اٹھنی کے کچھ بھی نہ تھا۔ بلا ٹکٹ ہی سفر کرنا تھا تو فرسٹ کلاس میں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟ خیر میں نے اس کے ٹکٹ کے دام اور جرمانہ ادا کر دیا۔ کانپور اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں دفعتاً سوتے سے جاگ پڑا۔ میں نے دیکھا کہ وہی حضرت میرا سوٹ کیس لئے درجے سے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑا اور پولیس کے سپرد کر دینے کی دھمکی دی تو پھر خوشامد کرنے لگے۔ دوسرے مسافروں نے بھی انھیں گھیر لیا بلکہ ایک مسافر تو گارڈ کو بلا بھی لایا لیکن مجھے ترس آ گیا اور میں نے اسے کہہ سن کر پھر چھڑا دیا۔"

میں خاموش رہا تاکہ یہ ناخوشگوار موضوع ختم ہو جائے اور کچھ دیر کے سکوت کے بعد میرا ساتھی بعض کھانوں کی تاریخی روایات پر روشنی ڈالتا رہا۔ پھر دفعتاً دو بیرحوں کو ایک کونے میں کچھ گفتگو کرتے دیکھ کر بول اٹھا: "اب دیکھئے یہ لوگ بھی باتیں کر رہے ہوں گے کہ دیکھیں ہم دونوں بے وقوفوں سے انھیں

کیا ٹپ یا بخشش ملتی ہے۔ یوں چاہے میں ایک لاکھ روپیہ صرف کر دوں لیکن بے وقوف بن کر ایک پیسہ بھی صرف کرنا مجھے بہت گراں گزرتا ہے۔ ہوٹل کے بیروں کو ٹپ دینے سے مجھے سخت نفرت ہے۔ کیا اپنے کام کے لئے تنخواہ نہیں پاتے ہیں یہ؟ خیرات ہی کرنا ہے تو ان سے کہیں زیادہ ضرورت مند دوسرے لوگ ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو اگر صرف اپنی شان جتانا مقصود ہے تو یہ پرلے درجے کی کم ظرفی ہے۔"

پھر ایک بیرے کو اشارے سے قریب بلا کر کہا: "دیکھو ہم دونوں کا بل ایک ہی بنے گا!" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی جیب سے ایک بہت تندرست منی بیگ نکالا اور اس میں سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکال کر دوسری جیب میں رکھ لئے۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا ارادہ مشترکہ بل کی ادائیگی کا ہے لہٰذا میں نے فوراً ٹوکا: "دیکھئے میں اپنے کھانے کا بل خود ادا کر دوں گا۔"

ہاتھ کے اشارے سے مجھے اس سلسلہ میں خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے بولے: "آپ نے کپور کے یہاں کا حلوہ سوہن تو کھایا ہی ہوگا۔"

میں نے کہا "جی نہیں! اور مجھے حلوہ سوہن کا کچھ ایسا شوق بھی نہیں ہے۔"

بولے! "شوق نہیں ہے تو ہونا چاہیئے۔ دیکھئے ابھی منگاتا ہوں آپ کے لئے۔"

بیرے کو آواز دے کر کہا "دیکھو تم ذرا لمبے قدموں جا کر کپور حلوائی کے یہاں سے پاؤ بھر حلوہ سوہن لے آؤ۔"

بیرے نے معذرت کی! "حضور میں کپور حلوائی کی دوکان نہیں جانتا اور پھر مجھے رسٹوراں سے باہر جانے کا حکم بھی نہیں ہے۔"

خفا ہو کر بولے!" اجی ابھی ایک روپیہ ٹپ دینے کو کہوں تو تمہارے

ہیں میں فوراً پہیے لگ جائیں گے اور تم سامنے نکڑ پر کپور حلوائی کی دوکان تک جانے کے بجائے بنارسی باغ تک کی ہوا کھا آؤ گے۔" اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بس ایک منٹ!" اور میرے منع کرنے کے باوجود پیکتے جھپکتے حلوہ سوہن لینے چلے گئے۔

میں نے ان صاحب کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ آدھ گھنٹہ انتظار اور مشترکہ بل کی ادائیگی کے بعد ریسٹوراں سے باہر نکلا تو محض اس خیال سے کہ کہیں وہ بیچارے کسی حادثے کا شکار نہ ہو گئے ہوں میں نے ان کے متعلق تفتیش کی تو پتہ چلا کہ ریسٹوراں سے نکلتے ہی وہ ایک تیز دم رکشے پر بیٹھ کر کسی نامعلوم منزل کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔

دادا جان

کردار

مرزا .... دادا جان کے پوتے

نریش
رشید } مرزا کے دفتر کے ساتھی
گرجا شنکر

کملا .... نریش کی بیوی

مقام اور وقت .... حسب پسند

(پہلا منظر)

کملا۔ تو آج آپ کے دوست آ رہے ہیں جن کے دادا جان بڑے زبردست پہلوان تھے!

نریش۔ (ہنستے ہوئے) ہاں! ہاں زبردست پہلوان تھے! مرزا صاحب نے پانچ بجے آنے کا وعدہ کیا تھا اب چند ہی منٹ میں آ رہے ہوں گے۔

کملا۔ ان کے دادا جان نے ایک وقت میں دو پہلوانوں کو اکھاڑے سے باہر اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

(قہقہہ)

نریش۔ تم نے تو ابھی تک ان کے دادا جان کی پہلوانی کے صرف چند کارنامے

سنے ہیں۔ ان کے دادا جان بیک وقت سب سے بڑے پہلوان۔ نجومی۔ فلاسفر۔ سپاہی۔ حکیم۔ سیاح۔ شکاری۔ شاعر اور نہیں معلوم کیا کیا کچھ تھے۔

کملا۔ پھر تو دادا جان کے اگر سارے کارنامے جمع کر دیئے جائیں تو شاید ایک دوسری طلسم ہوشربا تیار ہو جائے۔

نرلش۔ اس میں کیا شک ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ دادا جان کے کارناموں کے مقابلہ میں طلسم ہوشربا بچوں کو سلانے والی ایک لوری معلوم ہو گی۔

کملا۔ دادا جان کچھ بھی رہے ہوں لیکن ان کے پوتے واقعی بڑے زبردست داستان گو واقع ہوئے ہیں۔

نرلش۔ آج نو برس سے میں اور مرزا صاحب ایک ہی دفتر میں کام کر رہے تھے اور شاید ہی کوئی دن جاتا ہو جب وہ مجھے اور دیگر ساتھیوں کو دادا جان کے دو چار تازہ بتازہ ملفوظات نہ سناتے ہوں۔

کملا۔ (ہنستے ہوئے) دادا جان نہ ہوئے عذاب جان ہو گئے۔

نرلش۔ رشید نے ایک دفعہ یہ تجویز رکھی تھی کہ آئے دن دادا جان کے ملفوظات سننے کے بجائے کسی آٹھ دس روز کی چھٹی میں ایک بڑے پیمانہ پر دادا جان کی تقریب منائی جائے اور مرزا صاحب سے درخواست کی جائے کہ دادا جان کے جس قدر بھی ملفوظات ہوں وہ اس موقع پر ایک دم سے سنا ڈالئے۔ اس کے بعد پھر دفتر میں دادا جان کا نام نہ لیجئے گا۔ ورنہ ہم لوگ استعفے دیدیں گے اور ہمارا آپ کا اتنی مدت کا ساتھ چھوٹ جائے گا۔

کملا۔ پھر کیا ہوا اس تجویز کا؟

نرگس۔ مرزا صاحب نے کہا کہ اگر آپ لوگ دادا جان کی کوئی تقریب منانا
چاہتے ہیں، تو یہ آپ لوگوں کی عین قدر شناسی بلکہ سعادتمندی ہے۔
لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں دریا کو کوزے میں بند کر سکتا ہوں
سمندر کو نہیں۔

کملا۔ مطلب یہ کہ میں دادا جان کے حالات ہر روز بیان ہی کرتا رہوں گا۔
اور آپ لوگوں کے استعفے دیدینے کے متعلق کیا کہا مرزا صاحب نے؟

نرگس۔ انھوں نے اور ڈرا دیا ہم لوگوں کو۔ کہنے لگے۔ تمہارے ساتھ میں
بھی استعفے دیدوں گا۔ دادا جان کا کمایا گھر میں بہت کچھ رکھا ہوا ہے
دفتر میں اطمینان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ پھر اطمینان سے
گھر پہ باتیں ہوا کریں گی۔

کملا۔ (ہنستے ہوئے) خوب آدمی ہیں آپ کے مرزا صاحب بھی۔ لاجواب کر دیا
سب کو۔

نرگس۔ گرجا شنکر نے تجویز رکھی تھی کہ دادا جان کے ملفوظات بیان ہوتے وقت
اکثر ساتھی غیر حاضر ہو جایا کرتے ہیں، لہٰذا مرزا صاحب ان کو کتابی
صورت میں کیوں نہ شائع کر دیں تاکہ اس کے نسخے خرید کر ہم میں سے
کوئی بھی دادا جان کی زندگی کے کسی بھی پہلو سے ناواقف نہ رہ جائے۔

کملا۔ بہت خوب! پھر کیا کہا مرزا صاحب نے؟

نرگس۔ کہنے لگے کاغذ کی یہ گرانی کم ہوئے تو پھر غور کروں گا اس تجویز پہ!۔

کملا۔ میں آج مرزا صاحب سے ایک شکایت کروں گا۔

نرگس۔ کیا۔

کملا۔ کہوں گی کہ آپ دادا جان کے ملفوظات بیان کرتے وقت دادی جان

کے ملفوظات کیوں فراموش کر جاتے ہیں۔ یہ بڑی نا انصافی ہے صنف نازک کے ساتھ! آخر کبھی کبھی دادی جان کے ملفوظات بھی سنا یا کیجئے آپ!۔

نرلیش۔ ضرور کہنا۔ لیکن تم مرزا صاحب کی داستان گوئی کے وقت ان سے جرح کیوں کرنے لگتی ہو؟۔

کملا۔ جرح کہاں کرنے لگتی ہوں؟ میں نے ان سے ایسے ہی ایک آدھ سوال پوچھ لیا تھا اس روز!

نرلیش۔ اس سے جھنجلا اٹھتے ہیں! وہ تو بس چاہتے ہیں کہ ع۔
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

(کمرے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

مرزا۔ کیا میں آسکتا ہوں؟

نرلیش۔ مرزا صاحب ہیں؟ آیئے آیئے تشریف لایئے۔

کملا۔ نمستے بھائی صاحب! ہم لوگ تو انتظار ہی کر رہے تھے آپ کا۔

مرزا۔ نمستے بھابی۔ پانچ بجے آنے کو کہا تھا میں تھوڑی سی دیر ہو گئی۔ معاف کیجئے گا۔

نرلیش۔ آیئے اس صوفے پہ آ جایئے مرزا صاحب!

کملا۔ میں چائے کے لئے کہے دیتی ہوں (باہر جاتی ہے)

نرلیش۔ رشید اور گرجا شنکر تو نہیں ملے تھے آپ کو؟

مرزا۔ بھٹی میں خوب غوطہ لگاتے ہیں وہ لوگ! اپنے گھر والوں کو ایسا سکھا رکھا ہے ان دونوں نے کہ جیسے ہی ان کے دروازوں پہ پہنچتا ہوں، میرے آواز دینے سے بیشتر ہی ان کے گھروں سے آوازیں

آنا شروع ہو جاتی ہیں کہ "گھر میں نہیں ہیں"۔ "گھر میں نہیں ہیں"۔ "دادا جان سے ملنے گئے ہیں"۔ اس معاملہ میں میرے دادا جان کا ایک عجیب و غریب اصول تھا........"

(کملا چائے اور ناشتہ لے کر آ جاتی ہے)

مرزا۔ اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی؟ میں تو اب صرف سادہ چائے پیتا ہوں شام کو۔

کملا۔ تکلف کیا ہے اس میں؟ آپ ناشتہ کیجئے میں چائے بناتی ہوں۔ (برتنوں کی کھنک)

نریش۔ آپ کو آنے میں دیر ہوئی تو ہم دونوں کو اندیشہ ہوا کہیں بھول تو نہیں گئے آپ؟

مرزا۔ بھائی میں گھر سے ٹھیک وقت پر چلا تھا۔ لیکن منڈی کے قریب پہونچ کر میں نے دیکھا کہ ایک موٹا تازہ ہاتھی جھومتا چلا جا رہا ہے اسے دیکھتے ہی خدا بخشے دادا جان یاد آ گئے اور میں دس پندرہ منٹ تک سکتے میں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔ بس اسی میں کچھ دیر ہو گئی۔

کملا۔ (تعجب سے) ہاتھی دیکھ کر آپ کو دادا جان یاد آ گئے؟ کیا مرحوم بڑے تن و توش کے بزرگ تھے؟

مرزا۔ (جلدی سے) نہیں نہیں مرحوم تو بڑے گٹھے جسم کے کسرتی پہلوان تھے۔ البتہ ان کو ہاتھیوں سے بڑی دلچسپی تھی بلکہ عشق تھا! ان کے فیل خانے میں کم سے کم پچاس ہاتھی تھے ایک سے بڑھ کر ایک گراں ڈیل اور دیو پیکر اور دادا جان دن رات ان ہی کے کھلانے پلانے، نہلانے، دھلانے اور دوسری خاطر تواضع میں لگے رہتے"۔

نریش۔ ایک فوج کا ایسا انتظام کرنا پڑتا ہوگا ان ہاتھیوں کے لئے۔

مرزا۔ بس کچھ نہ پوچھئے۔ سویرا ہوتے ہی ڈنکا بجتا۔ سب ہاتھی لوٹ پوٹ کر دریا پر جانے کے لئے تیار ہو جاتے۔ دریا کے راستے میں سیکڑوں بیگہ گنا بوا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ دریا پر جاتے ہوئے راستے میں ہاتھی گنوں کا یا فصل کی دوسری سبزیوں کا ناشتہ کرتے جاتے پھر دریا کے بڑے میدان میں ان کی قواعد ہوتی اور ان کو مختلف کرتب سکھائے جاتے۔ اس کام کو دادا جان ہمیشہ خود بہ نفس نفیس کرتے جس طرح بچوں کو جب سبق یاد نہیں ہوتا تو سزائیں دی جاتی ہیں بالکل اسی طرح کرتب نہ سیکھنے پر ہاتھیوں کو سزائیں دی جاتی ہیں۔

کملا۔ (ہنستے ہوئے) یعنی ہاتھیوں کو بھی مارا جاتا تھا۔ یا کان پکڑ کر اٹھنا بیٹھنا یا مرغا بننا پڑتا۔

مرزا۔ جی ہاں! ان ہاتھیوں کے متعلق بالکل مکتب کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا دادا جان نے۔ قواعد کے بعد ہاتھی فیل خانے لائے جاتے کچھ دیر آرام کرتے پھر ان کو دوپہر کا راتب دیا جاتا۔ روغنی روٹی، گڑ، دودھ۔ تازہ سبزیاں وغیرہ وغیرہ، شام کو پھر ان کی کشتیاں اور دوڑیں ہوتیں۔ واقعی دادا جان نے ان ہاتھیوں کے پیچھے اپنی زندگی تج دی تھی۔ صبح منہ اندھیرے فیل خانے پہونچ جاتے اور رات میں ان کا دوسرا راتب خود اپنے سامنے کھلوا کر آدھی رات کے قریب مکان واپس آتے۔

کملا۔ اس روز تو آپ فرماتے تھے کہ دادا جان بڑے زبردست پہلوان تھے تو پھر وہ ہاتھیوں کی کشتیوں کے علاوہ خود کس وقت اپنی کشتی لڑتے تھے؟

مرزا۔ بس فیل خانے ہی میں انھوں نے ...... اپنے لئے ایک اکھاڑہ کھدوا لیا تھا۔۔۔ اور کوئی نہ ملتا تو کسی ہاتھی ہی سے زور لگوایا کرتے۔"

(کملا اور نرپش قہقہے لگاتے ہیں)

نرپش۔ اور شاعری سے کب شغل فرماتے تھے وہ؟

مرزا۔ اجی ان کے سب شغل بس اسی فیل خانے میں ہو جایا کرتے تھے (کملا اور نرپش پھر قہقہے لگاتے ہیں) خود دادا جان کی خاص سواری کا ہاتھی "پہاڑا" اسم بامسمیٰ تھا۔ چلتا تو معلوم ہوتا کہ کسی پہاڑ کے پر لگ گئے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سونڈ اٹھا کر اڑتی چڑیا کو پکڑ سکتا تھا اور اس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ دادا جان اس پر سوار کسی شکار کا پیچھا کر رہے تھے۔ پہاڑا بے تحاشا بھاگ رہا تھا کہ دفعتاً دو ایسی پہاڑیاں آگئیں کہ ان کے بیچ سے پہاڑا کا نکل جانا ناممکن تھا ساتھیوں نے کہا پہاڑا کو موڑ دیا جائے دادا جان بھلا اپنا شکار کب چھوڑنے والے تھے ان کو بُرا معلوم ہوا اور انہوں نے "ہاں پہاڑا" کہہ کر پہاڑا کو آگے ڈھکیل دیا۔ اور پہاڑا نے ایک فلک شگاف چنگھاڑ کے ساتھ جو زور مارا تو یقین مانئے گا کہ وہ دونوں پہاڑیوں کے درمیان سے تیر کی طرح نکل گیا۔

نرپش۔ اپنا بدن سکیڑ لیا ہوگا پہاڑا نے؟

کملا۔ اور ہو سکتا ہے، پہاڑیاں ہی کھسک گئی ہوں اپنی جگہوں سے۔

مرزا۔ پہاڑا کی طاقت کی یہ کیفیت تھی کہ کشتی میں کوئی ہاتھی آیا ہی نہیں اس کے مقابلے پر۔ دادا جان چار چار ہاتھیوں سے بیک وقت زور لگواتے تھے اُسے۔

سنتے ہیں ایک دفعہ دہلی کے کسی دربار کے موقع پر مہاراجہ اندھیر نگر کا ایک ہاتھی پاگل ہو کر چنگھاڑتا ہوا، وہاں موجود سیکڑوں ہاتھیوں کے غول پر جھپٹ پڑا تھا، ہاتھیوں کی ایک عام بھگدڑ مچ گئی۔ ذرا دیر اور اگر یہی کیفیت

رہتی تو ہزاروں کا قتلِ عام کیا ہوتا۔ آدھا شہر ان بدحواس ہاتھیوں کے پیروں کے نیچے روند جاتا کسی کی ہمت نہ پڑتی جو اس بپھرے ہوئے بدمست اندھیر نگری ہاتھی کو قابو میں لا سکتا۔ اتفاق سے دادا جان اس وقت بہاڑا کی پیٹھ ہی پر موجود تھے انھوں نے فوراً اسے للکارا پھر کیا تھا بہاڑا کو جنبش ہوئی بہاڑا نے آگے بڑھ کر پہلی ہی ٹکر میں اندھیر نگری ہاتھی کو چاروں خانے چت گرا دیا۔ چچا جان نے روک لیا ورنہ بہاڑا اس کے پیٹ پر پاؤں رکھ کر وہیں اس کا کام تمام کر دیتا اندھیر نگری ہاتھی نے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن بہاڑا نے اسے بھاگنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اور ٹکریں مار مار کر جمنا میں جا گرایا اور پھر اگر اپنی سونڈ کا سہارا نہ دیتا تو ڈوب ہی جاتا کم بخت

نرملا۔ واقعی کمال ہی کر دیا بہاڑا نے۔

کملا۔ شیر سے کبھی مقابلہ ہوا بہاڑا کا؟

مرزا۔ بیسوں مرتبہ۔ بلکہ سچ پوچھئے تو بہاڑا کو دراصل صرف شیر ہی کے شکار کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ نہیں معلوم کتنے شیر روند کر رکھ دیئے تھے اس نے۔ ایک دفعہ کوئی وائسرائے شیر کا شکار کھیلنے آئے ایک شیر کے گرد قریب ڈیڑھ سو ہاتھی حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ دفعتاً ایک جھاڑی سے نکل کر شیر جھپٹا اور ایک ہاتھی کی سونڈ کے اوپری حصہ سے لپٹ کر اسے جھنجھوڑنے لگا۔ ہاتھی خوفزدہ ہو کر بھیڑ کے بچوں کی طرح چیختے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ لیکن دادا جان کے اشارے پر بہاڑا جھپٹ کر آگے بڑھا اور شیر کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اوپر اٹھا لیا۔ اور پھر سونڈ گھما کر اس کو اس زور سے زمین پر پٹخا کہ سارا جنگل ہل گیا شیر اپنی پوری قوت سے دھاڑا لیکن بہاڑا نے بڑھ کر اس کے ایسی بھرپور

لات جمائی کہ اس کی نعش پچاس فٹ کے فاصلے پر جا گری۔

کملا۔ پہاڑ! کیا واقعی چلتا پھرتا پہاڑ تھا پھر آخر اس کا حشر کیا ہوا؟

مرزا۔ مرگیا بیچارہ۔ ع

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

کملا۔ بڑا صدمہ ہوا ہوگا دادا جان کو اس کی موت کا۔

مرزا۔ بس کیا بتاؤں کہ اس کے غم میں اس قدر روئے کہ اپنی ملازمت سے استعفےٰ دیدیا انھوں نے۔

کملا۔ تو کیا کہیں ملازم تھے وہ؟

مرزا۔ (بوکھلا کر ہکلاتے ہوئے) راجہ صاحب فیل نگر کے فیلبان تھے وہ!۔

(کملا اور نریش مارے ہنسی کے بیتاب ہو جاتے ہیں)

(پردہ)

(دوسرا منظر)

نریش۔ ارے بھائی رشید کچھ تم نے سنا کیا غضب ہو گیا۔؟

رشید۔ نہیں میں نے کچھ نہیں سنا!۔

نریش۔ کل شام کو کنچن جنگا اور ایورسٹ سے بھی اونچی چوٹی یعنی دادا جان گر پڑے۔

رشید۔ دادا جان گر پڑے!

گرجا شنکر۔ ارے یہ کیسے؟

نریش۔ بس کیا بتاؤں کیسے گر پڑے؟ نالائق اولاد کے ہاتھوں لائق

بزرگوں کا یہی حشر ہوا کرتا ہے ۔

گرجا شنکر۔ کچھ بتاؤ گے بھی یا یوں ہی پہیلیاں بجھاتے رہوگے ۔

نرپش۔ کل ہوا یہ کہ شام کو حسب وعدہ مرزا صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور حسب دستور لگے دادا جان کی قصیدہ خوانی کرنے ۔

رشید۔ اور قصیدہ کا موضوع کیا تھا ۔

نرپش۔ دادا جان کی فیلبانی اور موضوع کے لحاظ سے قصے بھی کچھ غیر معمولی طور سے بھاری بھرکم تھے ۔ دادا جان کے فیلخانہ میں کم از کم پچاس ہاتھی تھے ان کا مخصوص ہاتھی پہاڑ جو اپنی سونڈ سے اڑتی چڑیا پکڑ لیتا کبھی پہاڑوں کو ڈھکیل دیتا ، کبھی شیروں کو فٹ بال بنا دیتا وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن آخر میں اس کی ناگہانی موت سے مرزا صاحب کچھ ایسے بدحواس ہوئے کہ ان کے منہ سے نکل گیا کہ دادا جان سے اپنی ملازمت سے استعفےٰ دے دیا ۔ اور جب کملا نے پوچھا وہ ملازم کہاں تھے ۔ تو ہاتھیوں کی مناسبت سے انھیں مجبوراً کہنا پڑا کہ وہ راجہ صاحب نیل نگر کے فیلبان تھے ۔

(رشید اور گرجا شنکر قہقہے لگاتے ہیں)

رشید۔ اچھا تو یہ کہیئے کہ دادا جان محض فیلبان تھے ۔

گرجا شنکر۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے ۔ کانوں میں زخم ڈال دیئے تھے دادا جان کے بے سروپا قصوں نے ۔ اب مرزا صاحب نے کوئی لن ترانی شروع کی دادا جان کی شان میں تو ہم لوگ فوراً انھیں مرحوم کا عہدہ یاد دلا دیں گے ۔

نرپش۔ دیکھنا ایسا پہلو بچا جائے گا مرزا کہ منہ تکتے رہ جاؤ گے ! تو وہ

ابھی آرہے ہیں۔ دادا جان کے حماقت آب پوتے! میرا اس وقت تم دونوں کے پاس سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے ورنہ وہ سمجھیں گے کہ میں ہی نے کچھ لگائی بجھائی کر دی ہے۔

(نریش چلا جاتا ہے)

(مرزا آتے ہیں)

گرجا شنکر۔ اجی مرزا صاحب ادھر۔ آداب عرض!

رشید۔ آداب عرض ہے! خیریت تو ہے، مرزا صاحب آج آپ کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آرہے ہیں۔

مرزا۔ آداب عرض ہے! آداب عرض ہے۔ آج نریش کہاں ہے؟ آیا نہیں ابھی تک؟

رشید۔ آیا تو ہے شاید یہیں کہیں ہو۔ نصیب دشمناں مزاج کچھ ناساز معلوم ہوتا ہے؟

مرزا۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ البتہ آج سویرے سے کچھ نزلے کی تحریک معلوم ہو رہی ہے۔

گرجا شنکر۔ تو کچھ جوشاندہ وغیرہ پی لیتے آپ!

مرزا۔ بھائی تم جانتے ہو کہ میں سوائے اپنے دادا جان کے اور کسی کا علاج ہی نہیں کرتا۔

رشید۔ تو نبض دکھانے آپ کو دادا جان مرحوم کے مزار اقدس پر جانا پڑتا ہوگا؟

مرزا۔ (ہنستے ہوئے) اجی ان کی قبر کا کہاں پتا؟ کوئی کہتا ہے بیت المقدس میں ہے کوئی کہتا ہے کہ عراق میں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ بحر اسود میں ان کا جہاز ڈوب گیا۔ اور وہ سمندر ہی میں اللہ کے پیارے ہو گئے تھے۔ مجھے ان کی قبر کا پتا ہوتا تو قبر تک کیوں جاتا قدمبوسی کے لئے قبر ہی میں کیوں نہ چلا جاتا۔

گرجا شنکر۔ تو ان کی موت وطن سے باہر واقع ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہی نہیں تھا۔
ہم لوگوں کو۔

مرزا۔ جی ہاں وہ سیاحت عالم کے لئے تشریف لے گئے تھے لیکن نہیں معلوم کس منحوس گھڑی سدھارے کہ پھر ان کے بجائے ان کی خبر ہی واپس آئی۔

رشید۔ تو وہ عالم ارواح سے آپ کے لئے نسخے کیسے تجویز فرماتے ہیں؟

مرزا۔ اب کیا بتاؤں میں آپ کو؟ وہ اپنے معالجاتی تجربات کی ایک بہت مکمل اور مفصل بیاض چھوڑ گئے ہیں۔ دنیا نے آج ترقی کر ڈالی ہے لیکن میں نے آج تک کوئی ایسا مرض نہ دیکھا نہ سنا جو دادا جان جیسے مسیحا نفس کے سامنے نہ آیا ہو اور جس کو اپنی عدیم المثال تشخیص اور علاج سے انھوں نے چٹکی بجاتے زیر نہ کر لیا ہو۔ اپنی بیاض میں انھوں نے ہر ممکن مرض کا طریقہ تشخیص اور اس کا تیر بہدف نسخہ چھوڑا ہے۔ ہم لوگ گھر والے جب بیمار ہوتے ہیں تو اس بیاض کو دیکھ کر اپنا علاج کر لیتے ہیں۔

گرجا شنکر۔ تو مرزا صاحب اس عجوبۂ روزگار بیاض کو آپ شائع کیوں نہیں کرا دیتے؟

مرزا۔ اجی اب کوئی قدر شناس کہاں؟ ع
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

رشید۔ تو اپنے نزلے کے متعلق دادا جان کی بیاض کی کوئی دوا استعمال نہیں کی آپ نے؟

مرزا۔ سویرے ارادہ تھا کہ بیاض دیکھوں لیکن چنے کی اماں کا ہاتھ نہیں خالی تھا۔ مارے احتیاط کے نہیں معلوم انھوں نے کہاں کس بکس میں چھپا رکھا ہے اُسے۔

گرجاشنکر۔ تو کبھی ہم لوگوں کو بھی اس نادرالوجود بیاض کے شرف دیدار سے سرفراز کیجئے گا۔

مرزا۔ تم لوگ اسے خاک سمجھو گے۔ اس میں نسخوں کے ساتھ دادا جان کی سیاحت عالم کے واقعات بھی درج ہیں اور وہ پھر کچھ ایسے خط شکست میں لکھی ہوئی ہے کہ سوائے میرے اسے کوئی دوسرا پڑھ بھی نہیں سکتا اور ہاں اس کا کاغذ اس قدر بوسیدہ ہو چکا ہے کہ ع ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے، والا مضمون ہو گیا ہے۔

رشید۔ اس میں دادا جان کی سیاحت عالم کے واقعات درج ہیں تو غالباً ان کی وفات کے وقت یہ انھیں کے پاس موجود ہوگی۔ میرے خیال میں یہ بحر اسود میں مرحوم ہی کے ساتھ غرق آب ہو گئی ہوگی۔ اور اسی وجہ سے اس کا کاغذ اس قدر بوسیدہ ہو گیا ہے۔

مرزا۔ (ہنستے ہوئے) خوب بال کی کھال نکالتے ہیں رشید صاحب! جی نہیں جب آخری مرتبہ دادا جان سیاحت عالم کے لئے تشریف لے گئے تھے تو یہ بیاض ان کے پاس نہیں تھی۔ اُسے وہ گھر ہی چھوڑ گئے تھے وہ ایسے عاقبت نا اندیش نہیں تھے چلے سے بحر اسود میں ڈبونے کے لئے اپنے ساتھ لے جاتے۔ آپ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دادا جان نے سیاحت عالم صرف ایک مرتبہ کی تھی۔ اجی تین چار دفعہ کر چکے تھے وہ بقول شخصے ع

عمر گزری تھی اسی دشت کی سیاحی میں

بلکہ سچ پوچھئے تو اسی بیاض کی وجہ سے ان کو اپنی جان عزیز سے ہاتھ دھونا پڑا۔

گرجاشنکر۔ (تعجب سے) وہ کیسے؟

مرزا۔ وہ بیاض مکمل کر چکے تھے لیکن بعض مقامات کے متعلق ان کو کچھ شبہات باقی رہ گئے تھے۔ لہٰذا ان کو رفع کرنے کے لئے انھوں نے پھر از سر نو سیاحت کا بیڑا اٹھایا (بھرائی ہوئی آواز میں) اور کون جانتا تھا کہ یہ سفر آخرت ثابت ہوگا اور ہمیں ان کی خبر بھی آئی تو ایسی کہ ٹھیک سے پتا ہی نہیں چلا کہ ان کی وفات کب، کیسے اور کہاں واقع ہوئی۔

گرجا شنکر۔ یہ کیوں؟ آپ لوگوں نے پھر کوئی پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی؟

مرزا۔ (آہ سرد بھر کر) پتا لگانے کی تو ہم لوگ آج تک کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس وقت تک کوئی کامیابی نہیں ہو سکی ہے۔ جو شخص ان کی وفات کی خبر لا رہا تھا وہ راستے ہی میں خود بھی ختم ہو گیا۔ اور صرف ایک اڑتی پڑتی سی خبر ہم لوگوں تک پہونچ سکی۔

رشید۔ لیکن اپنے نسخوں کی بیاض میں دادا جان کو اپنی سیاحات عالم کے واقعات لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

مرزا۔ اب وہ اپنے نجی معلومات میں آپ کے جیسے عقلمند لوگوں سے رائے اور مشورہ تو لیتے نہیں تھے۔ ارے صاحبزادے اپنے نسخوں کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں انھیں ساری دنیا کی جڑی بوٹیوں اور دواؤں کی ضرورت تھی اور اسی لیے وہ اپنے تجربات کے سلسلہ میں سیاحت عالم کے لئے مجبور تھے پھر جہاں بیاض میں وہ نسخے لکھتے وہیں دواؤں کی خاصیتیں بھی لکھتے اور اس کے ساتھ ان کی جائے پیدائش پر بھی روشنی ڈالتے وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے اس کو آخری حد تک پہونچا دیتے۔

گرجا شنکر۔ واقعی بڑے حاذق حکیم ہوں گے وہ! آج کل اتنی تلاش و جستجو کون کرتا ہے۔؟

مرزا۔ حاذق حکیم؟ ارے بہت سے حکیموں کو حاذق دیکھا ہے لیکن وہ کچھ اور ہی چیز تھے۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک! اُن کو اپنے وقت کا مسیحا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یقیناً ان کے سامنے موت آتے شرماتی تھی اور کوئی تعجب نہیں اگر اسی وجہ سے ان کی وفات ایک ناگہانی بجری حادثے سے واقع ہوئی ہو کیونکہ صرف ایسی ہی صورت میں ان کی خدا حکمت مجبور ہو سکتی تھی۔ یقین کیجیے گا وہ مُردوں کو جلا دیتے تھے۔ مردوں کو!

گرجا شنکر۔ تو مرحوم کا پیشہ طبابت تھا۔ اور یہیں شہر میں مطب کرتے تھے وہ؟

مرزا۔ جی ہاں یہیں لال حویلی میں وہ مطب کرتے تھے۔ اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو حویلی کے سامنے جو بہت بڑا میدان قبرستان تک چلا گیا ہے وہ روز سویرے سے مریضوں سے کھچا کھچ بھر جاتا۔ ہر روز عجیب عجیب تماشے ہوتے ان کے مطب میں۔ اور پچاسوں آدمی تو محض ان تماشوں کو دیکھنے کی غرض سے ان کے پاس حاضری دیا کرتے۔ ایک مدقوق فالج زدہ مریض چارپائی پر دادا جان کے سامنے لایا جا رہا ہے، مارے نقاہت کے اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی ہے، آنکھیں کھولنا مشکل ہے، دادا جان اس کو نظر بھر کر دیکھتے ہیں اور پھر خفیف سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمودار ہوتی ہے، اور وہ میز کی دراز سے ایک سفوف کی چٹکی نکال کر مریض کو کھلوا دیتے ہیں۔ مریض پر عالم نزاع سا طاری ہو جاتا ہے، پھر ایکدم سے بالکل ساکت ہو جاتا ہے جیسے اس کا دم ہی تو نکل گیا ہو۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ کھانسنے لگتا ہے۔ اس کے زرد چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے وہ اٹھ کر دادا جان کو سلام کرتا ہے اور اپنے پیروں آپ گھر چلا جاتا ہے۔

(رشید اور گریجا شنکر قہقہے لگاتے ہیں)

رشید۔ یہ علاج تو نہیں معجزہ ہوا!

مرزا۔ جو بات سمجھ میں نہیں آتی ہے اسے معجزہ ہی کہہ دیا جاتا ہے۔ راجہ صاحب شیر پور کے پیر میں اتفاقاً تلوار کا ایک زخم لگ گیا تھا جو بعد میں زہرباد ہو گیا۔ رات دن راجہ صاحب کو تڑپتے گذرتی، ایک سے بڑا ایک معالج موجود تھا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کیا جائے اور بالآخر سب مایوس ہو کر موت کا انتظار کرنے لگے تھے بڑی مہارانی نے دادا جان کا نام سُن رکھا تھا۔ انھوں نے ان کو بلوایا۔ کئی دن کی مسافت کے بعد دادا جان پہونچے تو راجہ صاحب کی گھڑیاں گنی جا رہی تھیں۔ انھوں نے زخم کا معائنہ فرما کر اس پر اپنی جیب سے نکال کر ایک مرہم لگا دیا۔ مرہم کے لگتے ہی راجہ صاحب کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ سو گئے۔ دو گھنٹے بعد وہ سو کر اٹھے تو یقین مانیے گا کہ وہ یہ نہ بتا سکے کہ زخم ان کے داہنے پیر میں تھا یا بائیں پیر میں۔ دونوں پیر یکساں تھے اور کسی زخم کا نشان تک نہیں تھا۔ راجہ صاحب نے خوش ہو کر دو لاکھ روپے انعام دیئے جو دادا جان نے وہیں کھڑے کھڑے فقرا اور مساکین میں تقسیم کرا دیئے تھے۔

گریجا شنکر۔ بھئی مرزا اب حد ہو چکی۔ میں چلا۔

رشید۔ چلو میں بھی چلتا ہوں۔ البتہ مرزا صاحب سے ایک بات پوچھنا رہ گئی ہے۔

مرزا۔ وہ کیا۔؟

رشید۔ دادا جان کو عمل جراحی میں مہارت حاصل ہو گی؟

مرزا۔ عمل جراحی سے کیا مطلب تمہارا؟

رشید۔ مطلب یہ کہ جیسے آج کل آئے دن سننے میں آتا ہے کہ برطانیہ میں کسی ڈاکٹر نے ایک اندھے کے آنکھیں لگا دیں امریکہ میں ایک عورت کو مرد بنا دیا گیا۔ روس میں ایک شخص جو دل کی حرکت بند ہو جانے سے مر گیا تھا، کتے کا دل لگانے سے از سر نو زندہ کر دیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا اس طرح دادا جان نے بھی عمل جراحی میں کوئی شاہکار پیش کیا تھا۔

مرزا۔ اجی کیا بچوں جیسی باتیں کرتے ہو میاں رشید! عمل جراحی تو ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ آنکھ۔ ناک اور دل بدل دینا۔ عورت کو مرد۔ مرد کو عورت بلکہ بڈھے کو جوان اور جوان کو بڈھا بنا دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اجی ایک دفعہ تو انھوں نے ایک گدھے کے سینگ لگا دیئے اور پھر جب اس کی اولاد ہوئی تو اس کے بھی سینگ تھے۔ سب سے زیادہ لطف تو اس وقت آیا جب انھوں نے مذاق ہی مذاق میں ایک کتے کے سر پر ایک مرغے کا سر لگا دیا تھا۔ اور یقین ماننا جب مرغ بانگ دیتا اور کتا اس کو پکڑنے لئے اچھل کود مچاتا مگر اس کے خود اپنے سر پر ہونے کے باعث اس تک نہیں پہونچ پاتا تو لوگ ہنستے ہنستے پاگل ہو جاتے۔

(گرجا شنکر اور رشید قہقہے لگاتے ہیں)

گرجا شنکر۔ ہم لوگ جب سنتے ہی سنتے پاگل ہوئے جا رہے تھے تو ظاہر ہے کہ دیکھنے والوں پر کیا گزری ہوگی؟

رشید۔ لیکن مرزا صاحب کبھی ایسا تو نہیں ہوا کہ دادا جان مرغے کے دھوکے میں کتے کو ذبح کر بیٹھے ہوں۔

مرزا۔ بس خاموش! کیا گھناؤنے خیالات ہیں تمہارے چپ! چپ!
(گرجا شنکر اور رشید ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں)

(پردہ)

(تیسرا منظر)

مرزا۔ (ہنستے ہوئے داخل ہوتے ہیں) آداب عرض ہے۔ اچھا آج سب شکاری ایک ہی کمینگاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

کملا۔ نمستے بھائی صاحب! دراصل آج آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جارہا ہے۔

مرزا۔ جی ہاں مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ بات یہ ہوئی کہ میں آج ایک ضرورت سے ایک وکیل صاحب کے یہاں چلا گیا تھا۔ ایک معاملہ میں ان سے قانونی مشورہ کیا۔ لیکن کچھ تشفی نہ ہوئی مجھے اپنے دادا جان مرحوم یاد آگئے واللہ کس غضب کا قانونی دماغ پایا تھا انھوں نے بڑے بڑے بیرسٹر اور جج صاحبان ان کے سامنے پانی بھرتے۔

رشید۔ مرزا صاحب آج ہم لوگ یہ طے کرکے بیٹھے ہیں کہ ہم دادا جان کے متعلق اس وقت تک آپ کا کوئی نیا قصہ نہیں سنیں گے جب تک آپ اپنے پرانے بیان کئے ہوئے قصوں کی روشنی میں دادا جان کی پوزیشن صاف نہ کردیجئے۔

مرزا۔ کیا مطلب؟ اور آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے میرے دادا جان کی پوزیشن کی صفائی طلب کرنے والے؟

نرش۔ دادا جان کے قصے سنتے سنتے ہم لوگوں کے کان پک چکے ہیں اور

ابھی تک ہمیں یہ بھی حق حاصل نہ ہو سکا ؟

کملا۔ آپ لوگ خاموش رہیئے۔ آپ سب مجھے اپنا وکیل بنا چکے ہیں لہٰذا مرزا صاحب سے گفتگو کرنے کا حق صرف مجھ ہی کو حاصل ہے۔

گرجا شنکر۔ بالکل بجا ہے۔

کملا۔ تو ہاں مرزا صاحب فرمائیے کہ آپ کے دادا جان فیل نگر کے فیل بان تھے یا ملک کے سب سے نامور شاعر تھے یا سب سے زبردست پہلوان تھے یا ایک آفاق گرد سیاح عالم تھے یا مُردوں کو جلانے والے ایک مسیحا نفس حکیم تھے یا بیرسٹر اور ججوں سے پانی بھرانے والے قانوندان تھے یا......

مرزا۔ میرے دادا جان میرے دادا جان تھے۔

کملا۔ کیا مطلب ؟

مرزا۔ مطلب یہ کہ میرے دادا جان سب کچھ تھے اور کچھ بھی نہیں۔ آپ نہیں مانتے تو سمجھ لیجئے کہ وہ مقامی کانجی ہوز کے محرر تھے۔ رشوت ستانی میں موقوت ہو جانے کے بعد ایک بھینسا گاڑی سے ٹکرا کر شہید ہو گئے تھے اور ان کی ٹوٹی ہوئی قبر میرے مکان کی نکڑ پر واقع ہے۔

کملا۔ تو پھر یہ ان کے متعلق آپ اتنی لمبی چوڑی داستانیں کیوں بیان کرتے ہیں۔ ؟

مرزا۔ اپنا دل خوش کرتا ہوں اور تمہارا سب کا دل بہلاتا ہوں ورنہ داستان بیان کرنے والے پر لعنت اور دادا جان پر ہزار بار لعنت !!

(قہقہے)

(پردہ)

چند تبصرے

جناب رشید احمد صدیقی (علی گڑھ) "طنز و مزاح کی تخلیق کے لئے بڑے ضبط اور ریاضت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آپ اس امتحان میں پورے اُترے ہیں۔ آپ نے اپنے معاشرے کی بڑی دلچسپ ترجمانی کی ہے۔ آپ کا ذوق پاکیزہ اور آپ کو زبان پر عبور ہے۔"

جناب امتیاز علی عرشی (رام پور) "کئی مضامین اس سے قبل پڑھ کر لطف اندوز ہو چکا ہوں۔ مگر اس بار بھی یہ قند و نبات ہی معلوم ہوئے۔ آپ کے ذہن رسا اور زور قلم کی بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"

جناب کرشن چندر (بمبئی) "طنز و مزاح کے باب میں فطرت نے آپ کو جو صلاحیت بخشی ہے وہ درجہ اول کی ہے۔ آپ کا حس مزاح شستہ اور لطیف ہے۔ طنز میں برجستگی ہے اور زبان بڑی ہی دل آویز ہے۔"

جناب کنہیا لال کپور (موگا) "آپ نے یہ نیا طلسم توڑا ہے۔ آپ کی زبان کوثر میں دھلی معلوم ہوتی ہے۔ کامیاب مزاحیہ یا طنزیہ مضمون کی تعریف یہ ہے کہ اُسے متعدد بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کے بیشتر مضامین میں نے مزے لے کر بار بار پڑھے۔ بہت دنوں بعد کھل کر ہنسا ہوں۔ میں آپ کا مداح اور پرستار ہوں۔"

جناب غلام احمد فرقت (کاکوروی) "ماحول سے مزاح پیدا کرنا مراد آباد میں مردے زندہ کرنے سے کم مشکل نہیں ہے لیکن وجاہت کو یہ فن خوب آتا ہے۔ وہ ہنسانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کی باتوں پر خود بخود ہنسی آجاتی ہے۔ کاش کہ

وہ ایک اچھے انسان اور قابل ایڈوکیٹ نہ ہوتے بلکہ صرف مزاح نگار ہوتے اور کوئی اور کام کرنے کے بجائے صرف لکھتے ہی رہتے۔"

جنابہ واجدہ تبسم (بمبئی) "ان مضامین کا لکھنے والا کوئی معمولی شخص نہیں ہوسکتا۔"

جنابہ رضیہ سجاد ظہیر (دہلی) "وجاہت صاحب کی طرز نگارش کا کیا کہنا؟ ان کا ہر ایک مضمون قابل مبارک باد ہے۔ کئی دفعہ پڑھ چکی ہوں۔ ان کی تصنیف مزاحیہ ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔"

وجاہت علی سندیلوی کی دیگر تصانیف

• باقیات غالب	تنقید	3/-
• نشاط غالب	تنقید	
• بے ساختہ بے ضابطہ	مزاحیہ افسانے	2/75
• دودھ کے دھلے	مزاحیہ افسانے	3/50
• طشت از بام	افسانے	

چند مزاحیہ کتابیں

• داد کی بیداد	مزاحیہ مضامین	عبدالمجیب سہالوی	2/25
• مفلسی میں آٹا گیلا	"	"	3/-
• ٹرنکبس	ناول	"	2/-
• معمہ خاتون	ناول	"	1/50
• سسرال	ناول	"	2/-
• غزالہ	ناول	"	6/-
• مفدا نخواستہ	ناول	"	3/-
• کٹیا	ناول	"	5/-
• شیطان کی ڈائری	مضامین	"	1/50
• مونڈی کاٹے	"	"	1/50
• گرگٹ			1/50
• مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں	مضامین	فرقت کاکوروی	3/-